سلسلۂ انتخابات شعرائے دکن نمبر ۶

فیضِ سخن

انتخاب کلام میر شمس الدین محمد فیض

مرتبہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ام۔ اے۔ پی اچ ڈی لندن

مطبوعہ شمس المطابع مشین پریس نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

بار اول ۱۹۳۰ء قیمت ۱۲/

سلسلہ انتخابات شعرائے دکن

کی دوسری مطبوعہ کتابیں

(۱) سراج سخن — انتخاب کلام شاہ سراج اورنگ آبادی — مرتبہ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری
(۲) ایمان سخن — " شیر محمد خاں ایمان — مرتبہ مولوی سید محمد صاحب ام۔اے
(۳) بادۂ سخن — " ڈاکٹر احمد حسین مائل — مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور
(۴) کیف سخن — " سید رضی الدین حسن کیفی " — "
(۵) متاع سخن — " نواب عزیز یار جنگ عزیز " — "

ان مطبوعہ انتخابات کے علاوہ اس سلسلہ میں فی الحال حسب ذیل شعرائے دکن کے کلام پر کام ہو رہا ہے

(۱) عصر — میر احمد علی
(۲) تمیز — نواب بدر الدین خاں معظم الملک
(۳) مزاج — حکیم مظفر الدین خاں
(۴) صغیر — محمد حبیب الدین

فہرست

مرتب کی دوسری کتابیں

(۱) اُردو شہ پارے۔ ابتدا سے ولیؔ تک کے شعرا و مصنفین اُردو کا تذکرہ اور کلام۔ ۱۲/ ہے

(۲) اُردو کے اسالیب بیان۔ اُردو نثر کی اجمالی تاریخ ۴عہ/

(۳) عہدِ عثمانی میں اُردو کی ترقی۔ عہدِ حاضر میں دکن کی اُردو خدمات کا تذکرہ ۸عہ/

(۴) ہندوستانی لسانیات۔ اُردو زبان پر پہلی علمی و فنی کتاب عا/

(۵) ہندوستانی صوتیات (انگریزی) اُردو زبان کے صوتی پہلوؤں کا فنی مطالعہ للعہ/

(۶) روحِ تنقید۔ اُردو میں تنقید نگاری کے اصول و قواعد ۲عہ/

(۷) تنقیدی مقالات۔ مشہور اُردو شاعروں اور مصنفوں پر تنقیدی مقالے ۴/ ہے

(۸) طلسمِ تقدیر۔ ایک نیم تاریخی فسانہ ۸/

(۹) سیرِ گولکنڈہ۔ سولہ نیم تاریخی افسانوں کا مجموعہ .. .. .. عہ/

(۱۰) گلزارِ ابراہیم۔ اردو شاعری کا مشہور تذکرہ ۸عا/

(۱۱) محمود غزنوی کی بزمِ ادب۔ سلطان محمود کی مشہور بزم کا تذکرہ ۱۲/

(۱۲) فنِ انشا پردازی۔ فنِ انشا پردازی کے اصول و اسرار عہ/

مقدمہ

۱۔ دکن کی اردو شاعری

گذشتہ چار سو سال کے طویل عرصہ میں دکن میں سیکڑوں ایسے اردو شاعر پیدا ہوے جن کی مسلسل خدمت گذاریوں نے جہاں اپنے ملک کے ذوقِ ادب کو جاری رکھا اور اہل ذوق کی وقت بوقت ضیافت کی، زبان اردو کو ہمیشہ کے لئے مالامال بھی کردیا آن کے عمل پیہم اور پرخلوص ذوقِ سخن نے اس زبان کی بنیادیں بے حد مستحکم کردیں اور اس کے ادبی خزانہ میں ایک ایسا مستقل سرمایہ فراہم کردیا جو امتداد زمانہ کے بے رحم دستبرد کے بعد بھی اتنا وافر ہے کہ اردو بولنے والوں کی نسلیں ہمیشہ اس سے متمتع ہوتی رہیں گی۔

اِن قابل احترام خدمت گذارانِ اردو میں سے بیسیوں ایسے ہیں جن کے کارنامے آج موجود نہیں ہیں مگر اُن کے ہمعصر یا متاخر شاعروں کے کلام میں ان کا ذکرِ خیر باقی رہگیا ہے پچاسوں ایسے ہیں جن کے کارنامے موجود ہیں مگر جن کے حالات (اور بعض دفعہ تو مصنف کے نام تک) سے دنیا آج ناواقف ہے۔ اور نہ معلوم ایسے کتنے ہوں گے جن کے نام و نشان اور کارنامے دونوں اس وقت ناپید ہیں!!

تاہم اس کو اردو زبان کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے یا ان قدیم اردو شعرا کی نیک نیتی کہ مغلوں کے حملوں اور دکنی سلطنتوں کی باہمی خانہ جنگیوں اور تباہ کاریوں کے بعد سے قریب قریب ایک صدی تک مدفون رہنے کے باوجود اردو شعر و شاعری کے یہ قدیم اور بیش بہا گنجینے پھر منظر عام پر آرہے ہیں۔ چنانچہ عہد حاضر میں اردو کے بعض قابل ترین خدمت گذاروں نے ان کی تحقیق و تفتیش اور اشاعت میں اپنی گراں بہا زندگیاں وقف کردی ہیں۔

اِن باہمت افراد کی کوششوں سے اس وقت تک چند قدیم اردو شہ کاریا اُن کے حالات و انتخابات وغیرہ منظرِ عام پر آچکے ہیں مگر ابھی سیکڑوں ایسے ہیں جن کی نسبت اکثر و بیشتر سطحی معلومات ہی اردو رسالوں اور کتابوں میں پیش کی گئی ہیں۔ ضرورت ہے کہ انہیں بھی اکثروں کو شائع کیا جائے اور اس طرح نام نیک رفتگاں کو ضائع ہونے سے بچالیا جائے۔

ان قدیم جواہر پاروں کی اشاعت سے نہ صرف اردو ادب کے خزانۂ مطبوعات میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا اور اس کی تہی مائگی کی شکایت (جو اغیار کے علاوہ اکثر اپنوں سے بھی سنی جاتی ہے) دور ہوجائے گی' بلکہ اُردو بولنے والوں کی موجودہ اور آنے والی نسلیں اپنی زبان اور ادب کے مختلف النوع رجحانات اور صحیح ذوق سے بہرہ مند ہوسکیں گی' ہمارے نوجوان انشا پردازوں میں احساس خود اعتمادی بڑھتا جائے گا اور وہ اپنی زبان کی قدامت اور فضیلت کے اس ہمت افزا احساس کے ساتھ اس کی خدمت میں

سرگرم ہو سکیں گے۔

دکن کی اُردو شعر و شاعری کی تاریخ کے کئی مختلف عہد قرار دئے جا سکتے ہیں ابتدائی دور مذہبی اور صوفیانہ شعر و شاعری کا ہے جس کے متعلق اب تک چند مضامین شائع ہو چکے ہیں جن میں مولوی عبدالحق صاحب کا مضمون "اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ" خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس دور کی شاعری کے بعض چیدہ چیدہ نمونے تو منظر عام پر آ چکے ہیں مگر خاص خاص شعرا مثلاً شاہ علی گام دہنی اور شاہ برہان الدین جانم وغیرہ کے کلام کے مکمل مجموعے اب تک شائع نہ ہو سکے۔

اس ابتدائی دور میں مذہبی رنگ کی شاعری کے علاوہ دوسری قسم کی مثنویاں بھی لکھی گئیں جن میں "نظام نامہ" نمایاں حیثیت رکھتا ہے مگر ابھی شائع نہیں ہوا ہے۔

اردو شاعری کا دوسرا دور خالص ادبی اور حسن کارانہ مساعی پر مبنی ہے۔ اس عہد میں مقامی اور روزمرہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی اچھی نظمیں لکھی گئیں یا اور ادبیات فارسی کے بہترین شہ کاروں کا ترجمہ کرنے کا خیال بھی پیدا ہوا۔

اس عہد کے سب سے بڑے شاعر معانی، وجہی، عبدل، احمد، فیروز، محمود،

حسن شوقی اور خیالی وغیرہ ہیں ان میں اول الذکر چار اساتذۂ سخن کا بہت کچھ کلام موجود ہے مگر افسوس ہے کہ مکمل حالت میں شائع نہ ہو سکا۔ معانی محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) چوتھے فرمانروائے گولکنڈہ اور بانیٔ شہر حیدرآباد کا تخلص ہے۔ اس کے حالات اور کلام کے اقتباسات مولوی عبدالجبار خاں صوفی مرحوم نے اپنے قابل قدر تذکرۂ "محبوب الزمن" میں آج سے قریب پچیس سال پہلے پیش کئے پھر آٹھ دس سال قبل مولوی عبدالحق صاحب نے "رسالہ اردو" میں اس کے کلیات پر ایک دلچسپ مضمون لکھا اور نمونۂ کلام بھی شائع کیا نیز "دکن میں اردو"۔ "اردوئے قدیم"۔ "اردو شہ پارے" اور "جواہر سخن" وغیرہ کتابوں کے ذریعہ سے بھی اس کا کچھ نہ کچھ کلام منظر عام پر آیا ہے مگر ایک ایسے اعلیٰ پایہ استاد سخن کے مکمل گنجینۂ معانی کا شائع ہونا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس میں جملہ اصناف سخن یعنے غزل، قصیدہ، قطعہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ کے وافر اور عمدہ نمونے موجود ہیں۔

عہد معانی کے شعرا میں احمد اور وجہی قابل ذکر ہیں۔ احمد نے فارسی یوسف زلیخا کا ترجمہ کیا جس پر چند ہی سال قبل پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب نے ایک مضمون شائع کیا ہے۔ وجہی نے ایک اچھی مثنوی "قطب مشتری" (۱۰۱۸ھ) لکھی جس میں خود معانی (محمد قلی قطب شاہ) کی مشہور آفاق عشق عاشقی کی داستان

نہایت نفاست کے ساتھ بیان کی ہے ۔ یہ نظم اصل میں ابراہیم قطب شاہ کے عہد ہی میں معانی کے زمانہ ولی عہدی میں شروع کی گئی تھی ۔ اس میں تلنگانہ کی مشہور رقاصہ بھاگ متی (جس کی خاطر شہر بھاگ نگر بسایا گیا جو بعد میں حیدرآباد کہلایا) کے ساتھ شہزادہ ولی عہد سلطنت (معانی) کی ضرب المثل محبت و فریفتگی کا سچا اور زندہ جاوید مرقعہ پیش کیا ہے اس وقت تک اس اہم کارنامۂ سخن کے صرف ایک ہی نسخے کا پتہ چلا ہے جو انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہے (مگر وہاں کے کیٹلاگ مرتبہ پروفسر بلوم ہارٹ سے اس کا پتہ نہیں چلتا) راقم نے اس کو اشاعت کے لئے نقل کرنا شروع کیا تھا مگر افسوس ہے کہ پوری کتاب نقل ہونے پائی تھی کہ لندن سے روانگی کا زمانہ آگیا ۔

اس سلسلہ میں یہ ذکر شاید نامناسب ہوگا کہ ایسی عجیب و غریب مثنوی کے مصنف وجہی نے اس کے کئی سال بعد نثر میں بھی ایک عجوبۂ روزگار کتاب "سب رس" (سنہ ۱۰۴۵ھ) لکھی تھی جس کو مولوی عبدالحق صاحب نے کئی نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد انجمن ترقی اردو سے شائع کیا ہے ۔ وجہی کے دیگر کلام میں سے چند غزلیں اور مرثیئے بھی دستیاب ہوے ہیں جو رسائل میں شائع کردئیے گئے ہیں ۔

اسی زمانہ کا ایک اور شاعر عبدل تھا جو بیجاپور کے فرمانروا ابراہیم عادل شاہ

ثانی نورس (۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ) کی قدردانی سخن کا شہرہ سنکر بیجاپور آیا تھا۔ یہاں اُس نے وجہی کی طرح اپنے ولی نعمت سے متعلق ایک مثنوی "ابراہیم نامہ" لکھی جس کا تذکرہ رسالہ ہندوستانی میں چھپ چکا ہے۔

اردو شاعری کا تیسرا دور اُس کا عہد زرین سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں ہر ایک صنفِ سخن میں اس درجہ ترقی دی گئی کہ اس دور کے بعض شاعروں کو خدایانِ سخن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

غواصی، ابن نشاطی، جنیدی، قطب، عبداللہ، شاہی، طبعی، غلام علی، رستمی، ملک خوشنود، نصرتی، شاہ امین وغیرہ اس دور کے بیسیوں شاعروں میں سے وہ چند اساتذۂ فن ہیں جن پر اردو زبان فخر کر سکتی ہے۔

غواصی اصل میں اس سے قبل کے دور کا شاعر اور مشہور ملا وجہی کا حریف سخن ہے مگر اس کو اسی دور میں عروج حاصل ہوا۔ اس کے کلام میں سے صرف مثنویوں اور مرثیوں کے نمونے اس وقت تک دستیاب ہوئے ہیں جن کے اقتباسات شائع بھی ہو چکے ہیں۔ اس کی مثنویاں "سیف الملوک و بدیع الجمال" (۱۰۳۵ھ) اور طوطی نامہ (۱۰۴۹ھ) فارسی کے بہترین اردو ترجمے ہیں، اور اُپجی معلوم ہوتے ہیں۔

جنیدی "ماہ پیکر" (۱۰٦٤ھ) کا مصنف ہے۔ اس کے متعلق پروفسر محفوظ الحق صاحب نے ایک تفصیلی مضمون رسالہ ہندوستانی میں شائع کیا ہے جس میں اس کے کلام کے طویل نمونے بھی درج کئے ہیں۔ ابن نشاطی اصل میں نثر نگار تھا لیکن اس نے محض تجربتہً جو اعلیٰ پایہ مثنوی پھول بن (۱۰٦٦ھ) لکھی اس سے اس کی طبیعت کی نفاست اور ذوق کی خوبی کا پتہ چلتا ہے اس کے اقتباس "اردو شہ پارے" اور "یورپ میں دکنی مخطوطات" وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں مگر یہ ایسی کتاب نہیں ہے کہ اس سے ابھی اردو دنیا کو محروم رکھا جائے۔

قطب (سلطان محمد قطب شاہ متوفی ۱۰۳۵ھ) عبد اللہ (سلطان عبد اللہ قطب شاہ متوفی ۱۰۸۳ھ) اور شاہی (سلطان علی عادل شاہ ثانی متوفی ۱۰۸۳ھ) تینوں بادشاہ ہیں اور بادشاہ سخن بھی۔ ان کے کلام کے مجموعے موجود ہیں۔ اول الذکر تاجداروں کے کلام کے نمونے "محبوب الزمن" "اردوے قدیم" "اردو شہ پارے"۔ اور "دکن میں اردو" وغیرہ میں مندرج ہیں۔ شاہی کا کلیات حال ہی میں دستیاب ہوا ہے اور اس پر مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے ایک مضمون "رسالہ معارف" میں چھپوایا ہے۔ یہ تینوں مجموعے اردو مطبوعات میں قابل قدر اور اہم اضافے ہوں گے اگر یہ چھپ جائیں۔

طبعی اور غلامی گولکنڈہ کے شعرا ہیں اور اپنی شاعری کی خوبیوں اور اعلیٰ

خصوصیات کی وجہ سے سلطنت قطب شاہیہ کے آخری ملک الشعرا سمجھے جا سکتے ہیں۔ طبعی نے مثنوی "بہرام و گل اندام" (۱۰۸۱ھ) لکھی وہ ایک اچھا غزل گو بھی تھا اور دبستان وجہی سے متعلق تھا۔ اُس نے اپنے کلام میں وجہی کی طرح معنی آفرینی اور نزاکت خیال پر زیادہ زور دیا ہے۔ غلام علی عہد ابو الحسن تانا شاہ (۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۸ھ) کا شاعر ہے۔ اس نے "پدماوت" (۱۰۹۱ھ) کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ اس کے خیالات اور طرز ادا ظاہر کرتی ہے کہ وہ طبعی کے خلاف دبستان غواصی سے متعلق تھا۔ متذکرہ دونوں مثنویوں کے اقتباسات مختلف کتابوں میں چھپ چکے ہیں۔

رستمی، ملک خوشنود، نصرتی اور شاہ امین بیجاپور کے آخری بلند پایہ اساتذہ سخن ہیں۔ اور اِن سب کے کلام کے کچھ کچھ نمونے اس وقت تک منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اول الذکر دونوں عہد محمد عادل شاہ (متوفی ۱۰۶۷ھ) سے متعلق ہیں اور موخر الذکر علی عادل شاہ ثانی (متوفی ۱۰۸۳ھ) اور سکندر عادل شاہ (۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۷ھ) کے عہد سے۔

رستمی زبردست ادیب، قصیدہ گو، اور خطاط تھا۔ مگر اس وقت تک اس کی صرف ایک عظیم الشان اور نہایت ہی ضخیم مثنوی خاور نامہ (۱۰۵۹ھ) کا پتہ چلتا ہے جو اردو زبان کی سب سے طویل مثنوی ہے۔ اس کا نہایت مطلا و مذہب اور مصور نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ یہ کتاب اُن جملہ مثنویوں کے مقابلہ میں غالباً اول قرار دی گئی تھی جو بیجاپور کی

ملک شہر بانو بیگم کی فرمایش پر بیجاپور میں لکھی گئی تھیں۔

ملک خوشنود اصل میں گولکنڈہ ہی کا شاعر تھا مگر شہزادی خدیجہ سلطان شہر بانو بیگم کے ساتھ جہیز میں بیجاپور روانہ کیا گیا تھا جہاں محمد عادل شاہ کے دربار میں اس نے اپنے ذوقِ سخن اور حسن سلیقہ کی وجہ سے خاص منزلت حاصل کرلی تھی۔ اس شاعر کی دو مثنویوں "یوسف زلیخا" اور "ہشت بہشت" (سنہ ۱۰۵۶ھ) کا پتہ چلتا ہے جو امیر خسرو کی فارسی مثنویوں کے ترجمے ہیں۔

نصرتیؔ شاہی کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ اس کے قصائد اور مثنویاں (گلشن عشق سنہ ۱۰۶۸ھ اور علی نامہ سنہ ۱۰۷۶ھ) اردو زبان کے بہترین جواہر پارے سمجھی جاسکتی ہیں۔ اس کے حالات اور کلام کے نمونے مختلف کتابوں اور رسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔

شاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپور کے اولیائے کرام سے ہیں۔ اچھے شاعر بھی تھے مگر افسوس ہے کہ ان کا پورا کلام اب تک شائع نہیں ہوا۔

اس دور میں متعدد مرثیہ نگار مثلاً ہاشمیؔ، مرزاؔ وغیرہ بھی گذرے ہیں مگر ان کے مکمل مرثیے اس وقت تک دستیاب نہیں ہوسکے۔

اردو شاعری کا چوتھا دور ایک عبوری زمانہ پر مشتمل ہے۔ اس میں دکن کی سیاسی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی زبان اور شاعری بھی زوال پذیر ہونے لگتی ہے مگر یہ عہد اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس میں شمالی ہندوستان خاصکر دارالسلطنت

دہلی اُردو شعر و شاعری سے روشناس ہوا اور وہاں کے شعرا فارسی گوئی ترک کرکے اُردو شعر و سخن کی طرف مائل ہوئے۔

یہ فطرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ اگرچہ اس زمانہ میں بظاہر شمال کی مغل فوجوں نے دکن کو فتح کر لیا تھا مگر جہاں تک زبان و ادبیات کا تعلق ہے اصل میں دکن نے شمال کو فتح کیا۔ اگر اس وقت شہنشاہ اورنگ زیب کے ہاتھوں دکن کی سلطنتیں تباہ و برباد ہو جاتیں اور دکن کے خزائن علمیہ و ادبیہ اور گنجینہ ہائے شعر و سخن مال غنیمت بن کر مغل سپاہیوں کے ساتھ شمال نہ پہنچ جاتے، نیز دکنی شعرا اور اہل ذوق شمال میں اور شمال کے دکن میں آنے جانے نہ پاتے اور اس طرح اردو کی علمی و ادبی قابلیت کا اہل شمال کو احساس نہ ہونے پاتا تو نہ معلوم ابھی کتنے عرصہ تک شمالی ہندوستان میں اُردو زبان کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہتی اور فارسی کا دور دورہ رہتا۔

یہ زمانہ صحیح معنوں میں دورِ اختلاط کہا جا سکتا ہے کیونکہ صدیوں کے اختلاف و جدائی کے بعد اس عہد میں دکن اور شمال میں ایک گونہ تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ اس وقت دکن کے شاعروں میں جنھوں نے شمال کا سفر کیا ولیؔ، آزادؔ، فراقیؔ، عزلتؔ، اور دردمندؔ وغیرہ اور شمال کے شاعروں میں جو دکن آئے تھے ندیمؔ دہلی، فطرتؔ، آرزوؔ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا کے باہمی میل جول کے علاوہ جو واقعہ دہلی میں اردو شاعری کے آغاز کا باعث ہوا (اور جس کا ذکر ابھی کیا گیا)

دکن کی اکثر و بیشتر اردو کتابوں کا اورنگ زیب کی فتحمند فوجوں کے ساتھ مال غنیمت
بن کر شمالی ہند میں پہنچ جاتا ہے۔

اردو شاعری کے اس چوتھے دور کے سیکڑوں دکنی شاعروں کا پتہ چلتا ہے
مگر ان میں جو زیادہ مشہور ہیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔ عشرتی، عاجز، ولی
اورنگ آبادی، ولی ویلوری، فراقی، سراج، عزلت، وجدی، آگاہ، داؤد، صارم
وغیرہ اور مرثیہ نگاروں میں ہاشم علی، ذوقی، روحی، رضی، مرزا، قادر، غلامی، کاظم وغیرہ
اول الذکر دو کے کچھ حالات اور کلام کے نمونے شائع ہو چکے ہیں مگر ان کی
مثنویاں "دیپک پتنگ" "چت لگن" اور "ملکہ مصر" وغیرہ اب تک غیر مطبوعہ ہیں
ولی اورنگ آبادی اور ولی ویلوری دونوں کا کلام چھپ چکا ہے۔ اول الذکر کا
کلیات سب سے پہلے مشہور فرانسیسی محسن اردو گارساں وتاسی نے پیرس کے شاہنشاہی
دارالطبع سے شائع کیا تھا۔ اور چند سال قبل مولوی سید محمد احسن صاحب مارہروی
نے کئی نسخوں سے مقابلہ کر کے اس کا اور ایک مجموعہ شائع کیا ہے ولی دکنی کی
"روضتہ الشہدا" چھپی تھی مگر اب کمیاب ہے۔

فراقی، سراج، عزلت اور آگاہ کے کلام کے صرف نمونے چھپے ہیں۔ آگاہ پر
"انجمن طلبا قدیم دارالعلوم" کے سلسلہ تالیفات اردو میں ایک چھوٹی سی کتاب چھپی تھی
بعد میں پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب اور مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے
اس پر تفصیلی مضامین شائع کئے۔ شاہ سراج پر مولوی غفور احمد صاحب کام کر رہے ہیں

اس دور کے مرثیہ نگاروں کا مکمل کلام اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ ان کے حالات اور کلام کے چند نمونے راقم نے رسالہ اردو میں شائع کئے تھے۔ پھر مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے بھی اس موضوع پر کئی مضمون لکھے۔

اردو شاعری کے اس دور کی نسبت ابھی بہت کچھ معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ہے

دکن کی اردو شاعری کے پانچویں دور میں عاجز، درگاہ، شیدا، شفیق، تجلی، ایمان، قیس، چندا، شاداں، ایما، اور احسان وغیرہ قابل ذکر شعرا ہیں۔ اول الذکر دو مرثیہ گو تھے جن پر مولوی میر سعادت علی رضوی صاحب نے تحقیقی کام کیا ہے۔ چنانچہ درگاہ پر ان کا ایک تفصیلی مضمون "مجلہ عثمانیہ" میں شائع ہو چکا ہے۔ شیدا کی اعجاز احمدی بھی ایک دلچسپ مثنوی ہے۔

شفیق کے حالات، نمونہ کلام، اور تذکرہ (چمنستان شعرا) مولوی عبد الحق صاحب نے انجمن ترقی اردو سے شائع کیا ہے۔ شاہ تجلی اس دور کی عجیب و غریب شخصیت ہیں۔ انہیں فنون لطیفہ سے خاص شغف تھا۔ ان کی حیات اور کارناموں پر پروفیسر عبد القادر سروری صاحب سرگرم کار ہیں۔ ایمان پر سید اشفاق حسین صاحب کام کر رہے ہیں اور ان کے تلامذہ قیس اور چندا پر بھی سید اشفاق حسین صاحب اور سید اختر حسن صاحب علی الترتیب مصروف کار ہیں۔

شاداں (مہاراجہ چندو لال) اردو شعر و سخن کے فیاض سرپرست تھے ان کا دیوان

چھپ چکا ہے۔ مگر کچھ کلام ابھی غیر مطبوعہ ہے جس کو معین الدین صاحب رہبر نے مرتب کر لیا جو ابھی شائع نہیں ہوا۔

اس دور کے اردو شعرا شمالی ہند (خاصکر دہلی) کے شاعروں سے زیادہ متاثر تھے۔ یوں تو اس سے قبل کا دور بھی اہل شمال کے میل جول کی وجہ سے ٹھیٹ دکنی طرز سخن کا متبع نہیں رہا تھا مگر اُس دور کے شاعروں کی زبان دکنی ہی تھی اور اُن کے اثر سے شعرائے دہلی نے بھی دکنی زبان ہی میں اشعار لکھنے شروع کئے تھے۔ مگر اس اثنا میں مظہر اور اُن کے زیر اثر یقین سودا میر اور تاباں وغیرہ کی مساعی نے شمال سے اس دکنی اثر کو زائل کر دیا۔ اور وہاں کے شعرا دکنی طرز کو چھوڑ کر دہلی کے اردوئے معلیٰ کے محاورے اور زبان لکھنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکن کے شاعروں کو بھی اپنے وطن اور اسلاف کی زبان ترک کر کے شعر و سخن کے لئے دہلی کی زبان اختیار کرنی پڑی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ایک تو اس عرصہ میں دکن میں میر، سودا اور یقین جیسے اردو شاعر پیدا نہیں ہوے اور دوسرے چونکہ عہد قطب شاہیہ عادل شاہیہ کے بعد سے دکن کے حکام اہل شمال ہی تھے اس لئے دکن میں شمالی ہند ہی کے شاعروں کی قدر و منزلت ہونے لگی۔ چنانچہ اس وقت تک لطف، شہید، نصیر، مشتاق، آفاق، شہرت، منت، کمتر اور صفا وغیرہ جیسے بیسیوں شمال کے شعرا دکن آ چکے تھے۔

ان بیرونی شاعروں کی غیر معمولی قدر و منزلت دیکھنے کے بعد دکن کے شاعروں کو بھی انہی کی پیروی کا خیال پیدا ہوا چنانچہ اس دور کے دکنی شعرا کی زبان بالکل بدل گئی اصناف سخن کے لحاظ سے بھی وہ شمالی شعرا کے مقلد ہو گئے جس کی بنا پر طویل نظموں کا

رواج کم ہوگیا اور خاصکر رزمیہ و بزمیہ مثنویاں (جو قدیم دکنی شاعری کی جان ہیں اور جن کی وجہ سے اردو ادب کا خزانہ مالا مال سمجھا جاتا ہے) اس دور سے مفقود ہونی شروع ہوئیں۔

دکن کی اردو شاعری کے چھٹے دور میں فیضؔ، خاموشؔ، تمیزؔ، ذکاؔ، یاسؔ، عصرؔ، باقیؔ، فیاضؔ اور ناجیؔ وغیرہ اساتذۂ فن گذرے ہیں۔ اِس زمانہ میں شاعری کے بہ نسبت نثر کو زیادہ فروغ ہوا۔ یہ اصل میں دور تالیف و تراجم تھا کیونکہ اس وقت حیدرآباد میں نواب شمس الامرا اور ان کا خاندان مربی علم و فضل اور قدر دان ادب تھا اور اگرچہ خود اس خاندان میں اچھے شاعر پیدا ہوے مگر ان بزرگوں کو تاریخ و جغرافیہ کے علاوہ زیادہ تر سائنس اور ریاضی وغیرہ سے دلچسپی تھی۔

اِس عہد کے شاعروں میں فیضؔ خدائے سخن سمجھے جاتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اُن کے جیسا بلند مرتبہ شاعر اور کثیر التصانیف ادیب عہد قطب شاہیہ کے بعد سے حیدرآباد میں نہیں پیدا ہوا۔ اُن کے تلامذہ کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ گئی تھی چنانچہ خود اس موضوع پر ایک مبسوط تذکرہ موجود ہے۔ فیضؔ نے ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھیں جن میں سے بعض ان کی زندگی ہی میں شائع ہو چکی تھیں۔ ان کے حالات اور کلام پر مرزا سرفراز علی صاحب کام کر رہے ہیں۔

خاموشؔ اور ناجیؔ بھی اچھے شاعر تھے اول الذکر کا کلام چھپ چکا ہے وہ زیادہ تر مذہبی اور صوفیانہ رنگ میں لکھتے ہیں۔ موخر الذکر زیادہ تر نوحے لکھا کرتے تھے تمیزؔ نواب شمس الامرا کے

چھوٹے لڑکے بدرالدین خاں معظم الملک کا تخلص تھا۔ وہ ایک بڑے حسن کار اور اچھے شاعر تھے
ذکاؔ اس دور کے وہ حیدرآبادی سخن طراز ہیں جن کی شاعری کی مدحت طرازی میں مرزا
اسداللہ خاں غالبؔ کے کئی خطوط رطب اللسان ہیں۔

دکن کے شاعروں کا **ساتواں دور** مائلؔ، لمعہؔ، توفیقؔ، شایقؔ، معلیؔ، کیفیؔ، الم، آصفؔ
عثمانؔ، عزیزؔ، دلؔ، شادؔ، امجدؔ، صغیر اور ذہینؔ وغیرہ صاحبان سخن پر مشتمل ہے۔ افسوس ہے کہ
ان میں سے اکثر اب موجود نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے شادؔ، عثمانؔ، عزیزؔ، امجد اور صغیر وغیرہ کی
ہستیاں بسا غنیمت ہیں۔ اگرچہ اس دور کے اکثر شعرا کا کچھ نہ کچھ کلام چھپ چکا ہے لیکن بعض کے
مجموعے نہایت کمیاب ہیں۔

اِس دور کے قریب قریب جملہ شعرا بیرونِ ملک کے اساتذۂ فن (جو حیدرآباد آئے)
مثلاً میکشؔ، ترکیؔ، داغؔ، بیدلؔ، امیرؔ، نظم طباطبائی اور جلیلؔ وغیرہ کے تلامذہ ہیں ان کے
علاوہ اس عہد میں متعدد دوسرے شعرا مثلاً شیفتہؔ، علویؔ، حبیبؔ، ضامنؔ، جوشؔ، صدقؔ اور
فانیؔ وغیرہ بھی شمالی ہند سے دکن میں آئے۔

اِس دور کی اہم خصوصیت یہی ہے کہ اس میں گذشتہ دو ادوار سے قدیم معیاری اُردو
یعنے دکن کی زبان کو ترک کر کے شمالی یعنے جدید معیاری اُردو پر قابو حاصل کرنے کی جو کوشش
کی جا رہی تھی اس کو انتہائی مدارج پر پہنچایا گیا۔ زبان کے علاوہ اِس عہد کے دکنی شعرا نے
اصنافِ سخن میں بھی شمال کے اساتذۂ فن کے قدم بقدم رہنے میں بڑی کامیابی حاصل کی۔

اِس دور کے شعرا میں شایق، توفیق، امجد، صغیر اور شاد کے کلام میں تصوف کی جھلکیں نمایاں ہیں اور اِن میں سے بعض تو اردو کے بہترین عارف اور صوفی شعرا سمجھے جا سکتے ہیں۔ کیفی، ذہین اور آزاد نے عصرِ حاضر کی خصوصیات اور ضرورتوں کے لحاظ سے اپنی قوتِ سخن کے اظہار کے لئے نئے میدان پیدا کر لئے ہیں۔

دکن کی مسلسل خدماتِ شعر و سخن کا یہ ایک سطحی اور سرسری تبصرہ ہے۔ اس موقع پر تفصیل کی گنجایش تھی اور نہ ضرورت۔ اس حقیقتِ حال کا اعتراف لازمی ہے کہ اس سلسلہ میں بیسیوں ایسے شعرا کے نام شریک نہیں ہیں جو اساتذۂ فن کے رتبہ تک نہیں پہنچے یا جن کی نسبت ابھی ہماری معلومات محدود ہیں۔ وہ زمانہ آنے والا ہے جب اس قسم کے جملہ شاعر گوشہ گمنامی سے منظرِ عام پر آئیں گے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ اس وقت بعض نوجوان خاص خاص اساتذہ پر مشغول کار ہیں جن کا ذکر انہی صفحات میں اپنی اپنی جگہ پر درج ہو چکا ہے۔ یہاں البتہ اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ بعض احباب کی توجہ اور مشورہ سے فی الحال زمانہ حال یعنے دورِ ہفتم کے چند شعرا کے ایسے انتخابات شائع کرنے کا انتظام کیا گیا ہے جو اردو ادب میں اضافہ کا باعث ہوں گے، اور جن کے مطالعہ سے اردو کا ذوق رکھنے والے نوجوان اپنے ذوقِ سخن میں ترقی کر سکیں گے۔

فیض سخن

فہرست مضامین مقدمہ

استادِ کُل حضرت میر شمس الدین محمد فیض علیہ الرحمۃ
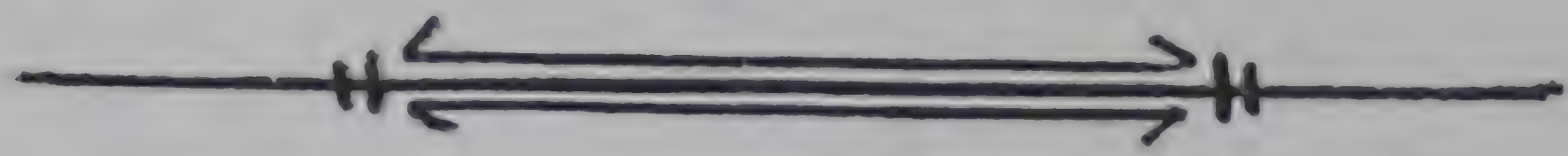
آج سے ٹھیک سو سال قبل حیدر آباد ایک ایسی با کمال ہستی کے فیوضات علمی و باطنی سے سیراب ہو رہا تھا جس کی یاد پوری ایک صدی گذر جانے کے بعد بھی باقی ہے اور شاید ہمیشہ باقی رہے گی۔ استاد الاساتذہ حضرت حافظ میر شمس الدین فیض رح کی شخصیت ایسی ہمہ گیر تھی کہ ہر ذوق کا انسان اُن سے بہرہ ور ہو سکتا تھا۔ انکی جودتِ طبع، غیر معمولی ذہانت، اور قلبی اور ذہنی کمالات کے تذکرے اب تک حیدر آباد میں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ اُن کی قوتِ سخن اور بدیہہ گوئی ضرب المثل تھی۔ اور اس مشغلۂ شعر و سخن سے زیادہ وہ تصنیف و تالیف کی دنیا میں مشہور تھے۔ اور سچ تو یہہ ہے کہ تصنیف و تالیف اور علم و فضل انکے فیوضاتِ باطنی اور کشف و کرامات کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے!

یہہ عجیب اتفاق ہے کہ دکن میں ہر سو سال کے ختم پر علمی و ادبی احیاء ہوتا رہا ہے جب کوئی مورخ اِس خوش قسمت سرزمین کی علمی و ادبی تاریخ قلمبند کرنا چاہے گا تو وہ اِس حقیقتِ حال کے انکشاف سے حیران رہ جائے گا کہ ہجری سنین کے لحاظ سے ہر صدی کے وسط میں دکن کے رشکِ فردوس کہساروں کے بسنے والے ایک ذہنی انقلاب پیدا کرتے رہے ہیں۔ ہر صدی کے انہی درمیانی سالوں میں دکن کی علمی و ادبی چہل پہل اور

قلبی و دماغی سرگرمیاں التزام کے ساتھ عروج کمال تک پہنچتی رہی ہیں۔ سنہ ۱۰۰۰ھ ایک ہزار ہجری سے آج تک برابر یہی عملدرآمد چلا آ رہا ہے۔ اور اگرچہ اس سے ماقبل زمانہ کی تاریخ ابھی اچھی طرح بے نقاب نہیں ہوئی ہے مگر کیا تعجب کہ اُن ازمنۂ قدیمہ میں بھی یہی التزام رہا ہو۔

تاریخ ادب اُردو سے شغف رکھنے والے ناواقف نہیں ہیں کہ وجہی، غواصی اور نصرتی و رستمی گولکنڈہ اور بیجاپور کے سب سے بڑے شاعر اور استادانِ فن ہیں۔ اور یہ سب سنہ ۱۰۵۰ھ میں موجود تھے۔ انکی مسیحا نفسیوں کی وجہہ سے گولکنڈہ اور بیجاپور کی شعر و سخن کی محفلیں زندۂ جاوید ہوگئیں۔ ان کے بعد ولی و سراج اور داؤد درگاہ کے زمانہ تک کوئی ایسے شاعر نہیں پیدا ہوئے جو جگت استاد ہو سکتے۔ یا جن کے اثر سے نہ صرف دکن بلکہ دور دور تک شمالی ہند میں بھی اُردو شعر و سخن کے سر چشمے ابل پڑتے۔

دکن کا یہہ تابناک عہد گیارہویں صدی ہجری کے بھی وسطی زمانہ ہی پر مشتمل ہے سنہ ۱۱۵۰ھ میں اورنگ آباد حضرت ناصر جنگ شہید کی علمی سرپرستیوں کی وجہہ سے رشک گولکنڈہ و بیجاپور بن گیا تھا۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی، نقد علیخاں ایجاد، اور اسد علیخاں تمنا وغیرہ جیسے نقادانِ فن اور اساتذۂ سخن اسی زمانہ میں اردو ادب کی گراں بہا خدمات دکن میں انجام دے رہے تھے ان کے بعد اگرچہ شاہ تجلی، ایمان اور شفیق جیسے باکمال افراد پیدا ہوئے لیکن یہہ زمانہ اصل میں دکن کی انفعالیت کا تھا۔ یعنے اس دور میں دکنی شاعروں اور ارباب علم سے زیادہ باہر سے آئے ہوئے شعرا اور علما و فضلا کی حیدرآباد میں قدر و منزلت ہونے لگی تھی اور اہل دکن نے بالکل پہلی دفعہ یہہ محسوس کیا تھا کہ اب تک وہ جس سجادہ اور

زبان میں لکھتے آئے ہیں (جو تین سو سال تک معیاری اردو رہ چکی تھی جس میں اس وقت تک سینکڑوں اعلےٰ پایہ کتابیں لکھی جا چکی تھیں، اور جن کو دیکھ کر دہلی کے ارباب ذوق نے فارسی ترک کر کے اردو میں لکھنا شروع کیا تھا) وہ اب معیاری نہیں رہی ہے۔ اور اب انہیں شمال کے شاعروں کی پیروی کرنی چاہئے۔

اسی خیال نے دکن کی شاعری کو بہت صدمہ پہنچایا، اور یہی احساس پستی ہے جسکی بناء پر دکن میں پھر وجہی و غواصی یا نصرتی و شاہی یا ولی و سراج جیسا استاد سخن پیدا نہ ہو سکا لیکن اہل دکن کے اس احساس پستی کے باوجود زمانہ کو اپنا چکر پورا کرنا تھا اور تاریخ چاہتی تھی کہ تیرھویں صدی ہجری کے وسط میں بھی حسب سابق دکن میں علمی و ادبی سرگرمیاں نقطۂ کمال تک پہنچ جائیں۔ چنانچہ قدرت نے حافظ میر شمس الدین فیضؔ جیسی باکمال ہستی کو پیدا کیا جو سنہ ۱۲۵۰ھ اور اس کے قریبی زمانہ میں حیدرآباد کی، علم و فضل اور شعر و سخن کی دنیا کو اپنے باطنی فیوضات اور علمی کمالات سے مالا مال کر رہی تھی۔ خوش قسمتی سے اسی عہد میں نواب شمس الامرا امیر کبیر اور ان کا خاندان علم و فضل کا دلدادہ تھا اور اس نے بھی اس وحید عصر شخصیت سے پوری طرح استفادہ کیا۔ یہہ زمانہ نواب امیر کبیر کی اردو نثر و تراجم کی سرپرستی و اشاعت اور حضرت فیضؔ کی اردو شعر و سخن کی خدمت کی وجہہ سے نہ صرف دکن بلکہ ادبیات اردو کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

اسوقت حیدرآباد کو پھر سے وہ قدیم علمی و ادبی عظمت حاصل ہو گئی جسکو وہ اب خواب و خیال سمجھنے لگا تھا۔ اب ایک اور دفعہ اہل حیدرآباد کو معلوم ہوا کہ خود انکے ملک سے

ایسے ایسے بلند پایہ اور صاحب ذوق افراد بھی اٹھ سکتے ہیں۔

حضرت فیض کے بعد نواب فصیح الملک مرزا داغ کی آمد اور حضرت غفراں مکاں آصفجاہ سادس کے شرف استادی کی وجہہ سے پھر سے دکن کے ارباب قلم شمالی شعراء و مصنفین کے دست نگر بنے رہے۔ اور اگرچہ ان میں مائل و واصل اور کیفی و توفیق جیسے بلند مرتبہ شاعر پیدا ہوئے لیکن ان سب کی شاعرانہ توتیں خود اعتمادی کی تحصیل میں صرف ہوگئیں یہہ دراصل حضرت آصفجاہ سابع سلطان العلوم خلد اللہ کی مسیحا نفسی اور زمانہ شناسی تھی جس نے جامعہ عثمانیہ کی تاسیس کے ذریعہ سے دکن کی علمی وادبی فتوحات کا بازار گرم کر دیا اور اس طرح اہل حیدرآباد اپنی دیرینہ روایات کے مطابق ۱۳۵۰ھ کے لگ بھگ اس قابل ہوگئے کہ علمی دنیا میں اپنی مستقل جگہ پیدا کرلیں عہد عثمانی میں حیدرآباد کے اہل قلم میں جو خود اعتمادی اور پختہ کاری پیدا ہوگئی ہے اسکے اعتراف میں اپنوں سے زیادہ بیگانے رطب اللسان ہیں۔ اور انہی کے زبان و قلم سے یہہ اچھا بھی معلوم ہوتا ہے۔

ہمیں اس موقع پر صرف اس حقیقت کا اظہار مقصود تھا کہ ہم اپنی ان علمی وادبی ترقیوں اور کامرانیوں کے گھمنڈ میں اپنے اُن اسلاف کو فراموش نہیں کرسکتے جنہوں نے ہم سے قبل اس سرزمین کے بسنے والوں میں علم و عمل اور اردو زبان و ادب کا سچا ذوق پیدا کرنے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں۔ ان قابل فخر محسنین میں استادِ کل حضرت فیض کا نام سب سے پہلے ہمیں یاد آئے گا کیونکہ وہ اسی زمانہ میں آج سے ٹھیک ایک سو سال قبل سرگرم عمل تھے اور آج ہم جبکہ ۱۳۵۶ھ میں ان کے متعلق یہہ مضمون لکھکر انکی یاد تازہ کررہے ہیں

ان کی ایک مختصر سی کتاب "فیض جاری" ہماری توجہ اپنی طرف منعطف کر لیتی ہے جو آج سے ٹھیک سو سال بیشتر قریب اسی زمانہ میں چھپ رہی تھی جب یہہ مضمون چھپ رہا ہے اس کتاب "فیض جاری" کے سرورق پر حضرت فیض نے جو سرخی درج کی ہے اسکا مطالعہ آج سو سال بعد کے اردو و انشا پردازوں اور شاعروں کے لئے ضرور دلچسپی کا باعث ہوگا۔ لکھا ہے۔

"رسالہ فیض جاری عہد میں نواب فلک جناب بندگان عالی حضرت آصفجاہ نظام الملک نظام الدولہ فتح جنگ میر فرخندہ علیخاں بہادر مدظلہ العالی کے شہر فرخندہ بنیاد حیدر آباد میں واسطے تعلیم طلبا کے، سرکار شمس الامرا بہادر امیر کبیر کے سنگی چھاپہ خانے کے درمیان سنہ ۱۲۵۶ھ میں چھپا۔"

حضرت فیضؒ نے مختلف موضوعوں سے متعلق اتنی کتابیں لکھی ہیں کہ قطب شاہی دور کے بعد حیدر آباد کے کسی بلند مرتبہ اردو شاعر نے نہیں لکھی۔ اردو اور فارسی کے علاوہ عربی زبان میں بھی ان کی کتابیں موجود ہیں، ان سب کے متعلق انکے زیر ترتیب سوانح حیات میں تفصیل سے معلومات پیش کئے جائینگے۔ یہاں یہہ بتا دینا کافی ہے کہ حضرت فیضؒ ایک بلند پایہ استادِ سخن ہونے کے علاوہ بہت بڑے انشا پرداز، عروضی اور عالم و فاضل بھی تھے قرات، خوشنویسی، اور خط ظفر کے ایسے ماہر تھے کہ بیرون ملک کے کاملینِ فن بھی انکے کمال کے قایل تھے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ کے ساتھ ساتھ تصوف و عرفان اور مذہب و روحانیت میں بھی انہوں نے آخر زمانہ میں وہ مرتبہ حاصل کر لیا تھا کہ ان کے جملہ تلامذہ انکو ولی کامل سمجھتے تھے۔ تلامذہ کے علاوہ انکے معتقدین اور مریدین کا بھی ایک بہت بڑا گروہ پیدا ہو گیا تھا جسکے سلسلہ کے افراد اب تک باقی ہیں۔

ان کے عرس اور یادگاری شاعرے قریب قریب نصف صدی تک بڑی دھوم دھام سے ہوتے رہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ انکا فیض اب تک جاری ہے۔

اُردو ادب کی تاریخ میں کہیں کوئی ایسا استادِ سخن نظر نہیں آتا جس کے تلامذہ اپنے استاد کے اتنے گرویدہ ہوں۔ اگرچہ مشہور رہے کہ حضرت فیض کسی کو اپنے سلسلۂ بیعت میں داخل کرنے میں بڑی احتیاط کرتے تھے لیکن انکے شاگردوں اور تربیت یافتوں کے علاوہ دیگر اصحاب بھی انکی بیعت کا شرف حاصل کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے اور جو انکے مرید نہ ہوسکے انکو بعد میں افسوس رہا کہ ہم نے ایک ایسا موقع کھو دیا جو پھر نصیب نہیں ہوسکتا۔

نواب مشرف جنگ فیاضؔ ان کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ انکے فرزند نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ فرماتے ہیں کہ حضرت فیض کے بعد حضرت فیاضؔ کو اکثر اس کا افسوس رہا کہ "میں نے حضرت کے ہاتھ پر بیعت کیوں نہیں کرلی"!

غرض حضرت فیضؔ کی وہ معتنم ہستی تھی جو کسی ملک و قوم میں صدیوں میں پیدا ہوتی ہے وہ ہمہ جہتی خوبیوں کے حامل تھے علم و فضل، زہد و تقویٰ، خدمت خلق، اور سلوک و معرفت کی فضیلتوں کے ساتھ ساتھ قدرت نے ان کو ایک اور نعمت بھی عطا کی تھی جس کا ایسی صاحب کمال ہستیوں کو حاصل ہوجانا ملک و قوم کیلئے آیۂ رحمت ثابت ہوتا ہے انہوں نے اٹھاسی ۸۸ سال کی طویل عمر پائی اور اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی ضایع نہیں کیا عنفوان شباب سے آخر عمر تک تعلیم و تعلم اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رہا حیدرآباد کے کم خوش نصیب ہونگے جنہوں نے اس استاد کل سے فیض نہ حاصل کیا ہو حضرت فیضؔ

بارہ سال کی عمر میں حافظ قرآن ہوئے[1] اور عنفوان شباب ہی میں وہ علمی شہرت حاصل کرلی تھی کہ عوام کے علاوہ شاہزادے اور امیرزادے بھی ان کے فیض صحبت اور تعلیم و تربیت سے مستفید ہونے لگے تھے۔ پچاس سال کی عمر تھی کہ عام علمی و ادبی شہرت کے ساتھ ساتھ مذہبی تقدس بھی حاصل کرلیا تھا۔ ان کا ایک ہم عصر مورخ خواجہ غلام حسین خاں سنہ ۱۲۶۰ھ سے قبل انکے متعلق اپنی مشہور و معروف تاریخ گلزار آصفیہ میں یوں رقمطراز ہے:۔

از کاملان زمانہ، و عارفان دورانہ، فرد کامل، و منتخب روزگار، جامع علوم عقلی و نقلی منبع کمالات صوری و معنوی...... از ابتدائے شباب متوجہ تحصیل علوم گردیدہ در عرصۂ چند سال مشہور روزگار گشتہ مرجع خلایق گردید۔ کمالات حقایق و عرفان و استحقاق و ادراک شریعتے و طریقتے آنجناب از اشعار فارسی و ہندی اردوئے خاص از قصیدہ و غزل و رباعی وغیرۂ آنحضرت مانند نور آفتاب تاباں

---

[1] حضرت فیضؔ کے حافظ قرآن ہونے کا واقعہ یہہ ہے کہ فیضؔ صاحب کے والد جس محلہ میں رہتے تھے اُس محلہ کی مسجد میں تراویح کا انتظام وہ خود کرتے تھے ایک سال حضرت کے والد بیمار ہوگئے تراویح کے لئے مسجد میں تشریف لائے اور فیض صاحب سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ قرآن کا حفظ کرنے کے لئے بارہا ہدایت دی گئی مگر تم نے توجہہ نہ کی اگر تم حفظ کرلیتے تو ہر سال حافظ کی تلاش کرنی نہ پڑتی اور ہمارے بعد بھی یہہ سلسلہ جاری رہتا ہمارے بعد کیا توقع ہے کہ تم حافظ کو تراویح کے واسطے مقرر کریں یہہ کہہ کر آب دیدہ ہوئے مگر اس تقریر کا حضرت فیض پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ بطور خود پوشیدہ طور پر قرآن کا حفظ کرنا شروع کیا جب دوسرا سال آیا تو ضعف پیری کی وجہہ خود انتظام نہ کرسکے حضرت فیض سے فرمایا کہ کسی حافظ کو حسب عادت مقرر کیا جائے جب رمضان کا چاند نظر آیا تو حضرت فیض اپنے والد کو لیکر مسجد تشریف لائے وہاں بجز مصلیاں مسجد دوسرے کی صورت نظر نہ آئی تو پوچھا کہ کیا حافظ جی ابھی نہیں آئے وقت ہوگیا ہے فیض صاحب نے عرض کیا کہ حسب ارشاد میں نے حفظ کرلیا ہے اس سال اجازت ہو تو میں خود تراویح پڑھاونگا یہہ سنکر سب کو تعجب ہوا حضرت کے والد نے پہلے دو رکعت نماز شکرانہ ادا فرمایا اور پھر تراویح پڑھی۔ اس سے حضرت فیضؔ کی ذہانت اور قوت حافظہ ثابت ہوتی ہے۔ ایک ہی سال میں سالم قرآن حفظ کرکے تراویح پڑھانا معمولی بات نہیں ہے۔

درخشاں وظاہراست۔ ہرذی فہم کہ بادراک فہم خویش فکر کند بجان سخن رسد۔

سوائے ایں حسن اخلاق وتہذیب ومروت وآدمیت از ملاقات آں جناب

ہویدا میگردد۔ درقرات کلام شریف یکتائے عہد خود تصانیف عربی وفارسی وہندی

آنجناب مشہور آفاق۔ معہذا در برآمد کار ارباب احتیاج بہ دمے، با درمے، با قدمے

یا قلمے مستثنائے زمانہ اند کہ ایں مقدمہ خیلے مشکل تر است علی الخصوص درین وقت

لہٰ........ در علم حقایق ومعرفت الٰہی نکاتے چند از زبان آں واقف رموز

خفی وجلی بوقت خلوص ملاقات برمی آیند کہ دل بے قرار شدہ می خواہد کہ ہمیں وقت

از سینہ برآید وترک علایق کند وبہ معبود حقیقی خود وصلت جوید ودیگر از خیال بیہودہ

دنیا کنارہ گزیند۔" (گلزار آصفیہ مطبوعہ صفحہ ۴۲۳ تا ۴۲۴)

یہہ طویل عبارت اس لئے نقل کی گئی ہے کہ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت فیض نے

سنہ ۱۲۶۱ھ سے قبل ہی یہہ رتبہ حاصل کرلیا تھا اور اسکے بعد وہ اور تئیس ۲۳ سال زندہ رہے

اور جب یہہ معلوم ہے کہ آخر وقت تک انکی مقدس زندگی کا ایک ایک لمحہ خلق خدا کی خدمت

میں بسر ہوا اور اس خوش قسمت سرزمیں کے بسنے والے اس نعمت ایزدی سے ہر لمحہ فیضیاب

ہوتے رہے تو محض اس واقعہ کا تصور ہی حضرت فیضؔ کی غیر معمولی عظمت کے نقوش

دلوں پر مرتسم کرنے کے لئے کافی ہے۔

اس خصوصیت میں بھی شاید ہی کوئی اور حضرت فیضؔ کی ہمسری کرسکے کہ انہوں نے

چار سلاطین آصفیہ کا عہد حکومت دیکھا اور پانچویں وارث تخت وتاج آصفی کی پیدائش کے

قطعات تاریخی بھی لکھے۔ وہ نواب نظام علیخاں آصفجاہ ثانی کے عہد حکومت میں ۱۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے اور انکی تیئیس سال کی عمر تھی جب آصفجاہ ثانی کا ۱۲۱۸ھ میں انتقال ہوا، اور نواب سکندر جاہ آصفجاہ ثالث تخت نشین ہوئے۔ لیکن نواب نظام علیخاں کے دور ہی میں انہوں نے ایک دیوان مرتب کر لیا تھا جو خود ان کے دست خاص کا لکھا ہوا ہے اور اس وقت راقم کے زیر مطالعہ ہے۔ اس میں ڈھائی ہزار سے زیادہ شعر ہیں۔ اس کے سرورق پر حضرت فیضؔ کی مہر ہے اور اس کے مجاز دیوان کا نام تاریخی مصرعہ میں "چشمہ فیضؔ اس کی ہے تاریخ" خود حضرت کے قلم سے لکھا ہوا ہے جس سے از قاعدہ جمل ۱۲۳۸ھ نکلتا ہے لیکن دیوان میں بعض شعر ایسے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ یہہ تاریخی نام بعد کو قرار دیا گیا حالانکہ دیوان کا بیشتر حصہ بہت پہلے لکھا جا چکا تھا۔ اسکا ایک شعر ہے ؎

ہے شمارِ سالِ عمر اپنا برس بائیس میں — کچھ نہ ہم سے ہو سکا اب تک سر انجام شباب

اس دیوان سے یہہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فیضؔ نے عنفوان شباب ہی میں فن عروض میں اجتہادی شان حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ بعض غزلوں کے حاشیہ پر خاص خاص بحریں لکھی ہوئی ہیں جن میں سے بعض خود ان کی ایجاد کردہ ہیں۔ مثلاً ایک دو غزلہ کے حاشیہ پر لکھا ہے:—

"بحر مجدد اختراع فیض۔ مفاعلن فعلاتن فاعلاتن۔ عکس بحرِ جدید"

اس غزل کا مطلع و مقطع یہہ ہے ؎

جو صبحدم کسی بام پر تو آوے — تو شکل مہر مقام پر تو آوے

میری غزل سے ہو فیض طائر دل — جو کھول کھول تمام پر تو آوے

اس دیوان کی چار پانچ غزلوں کے حاشیہ پر لکھا ہے۔ "شریک دیوان ثالث" جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دیوان کو حضرت فیض نے کم سنی کا کلام سمجھکر خارج کردیا تھا اور اس میں سے صرف چند غزلیں اپنے بعد کے دیوانوں میں شریک کی تھیں لیکن ان کے مطبوعہ دیوان میں اس دیوان کی شاید ایک آدہ ہی غزل موجود ہے اس لئے ہم نے اپنے انتخاب "فیض سخن" میں اس سے بھی اشعار منتخب کئے ہیں۔ اس چشمۂ فیض کے سلسلہ میں ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ حضرت کے فرزند میر حیات الدین صاؔفی کے دیوان میں اس دیوان کی بعض غزلیں بہ تبدیلی تخلص درج ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت فیض نے اس "چشمۂ فیض" کو اس طرح جاری رہنے دیا تھا جس کی بناء پر انکے فرزند کے دیوان میں بعض غزلیں شامل کردی گئی ہیں۔

نواب سکندرجاہ آصفجاہ ثالث کے عہد حکومت میں فیضؔ کو نواب شمس الامرا کی رفاقت کے علاوہ شاہی دربار سے بھی تعلق ہوگیا۔ چنانچہ نواب سکندرجاہ کی زندگی ہی میں اُن کی جانشینی کے متعلق جب قیاس آرائیاں ہونے لگیں تو حضرت فیض نے صاف صاف اپنی رائے کا اعلان کردیا کہ ؎

یوں تو کہنے کو سبھی ہیں چیدہ چیدہ آدمی	سایۂ دامانِ دولت میں سکندرجاہ کے
دوسرا کوئی نہیں ہے برگزیدہ آدمی	جز جنابِ ناصر الدولہ ریاست کے لئے

اس عہد میں نواب شمس الامرا امیر کبیر بڑے سخن پرور اور علم دوست امیر تھے۔ ناممکن تھا کہ وہ فیضؔ جیسی ذی کمال ہستی کو اپنی بارگاہ میں جگہ نہ دیتے۔ فیضؔ بھی ان کے ذوق

علم و عمل کے مداح تھے لیکن یہہ مدحت طرازی حرص و ہوس کا نتیجہ نہ تھی بلکہ خلوص اور علم دوستی کی خاطر۔ معلوم ہوتا ہے کہ امیر کبیر نے حضرت فیضؔ کو اپنے جملہ معاملات میں اپنا مشیر کار بنا لیا تھا انکی تصنیف و تالیف اور تراجم کی اشاعت کے اکثر مرحلے اسی استادِ سخن کے مشوروں سے طے ہوتے تھے۔ ان کی تقریباً ہر کتاب کی ترتیب و طباعت میں فیض کو بھی دخل تھا اکثر کتابوں کے نام انہی نے تجویز کئے تھے اور قطعات تاریخی بھی لکھے تھے۔ مشہور کتاب ستہ شمسیہ کی تاریخ تالیف اس مصرعہ میں نکالی ہے :-

شمس الامرا کی ہے یہہ تالیف
۱۲۵۴ھ

شمس الامرا کے لائق فرزند نواب عمدۃ الملک رفیع الدینخاں کی کتاب صنعتِ عمدہ کا قطعۂ تاریخ لکھا ہے ؎

عمدۃ الملک دام دولتہ　　　چوں پسندید دقتِ عمدہ

سال تاریخ او رقم زد فیضؔ　　　ہمگی ہست صنعتِ عمدہ
۱۲۶۹ھ

تصنیف و تالیف کے علاوہ فیضؔ نواب امیر کبیر کے تعمیری ذوق اور دیگر مشغولیتوں میں بھی برابر دلچسپی لیتے رہے۔ نواب امیر کبیر نے "قصرِ جہاں نما" اور اسکے بازارات کی تعمیر میں جو جدّت پیدا کی تھی اُس کا شہرہ ہندوستان سے گذر کر یورپ تک پہنچ چکا تھا ان بازارات کی تعمیر کی تاریخیں بھی فیضؔ نے بڑی دلچسپ نکالی ہیں جو اُن کے مطبوعہ دیوان میں درج ہیں یہاں نواب امیر کبیر کی وزارت اور وفات کے متعلق حضرت فیضؔ نے جو تاریخیں لکھی تھیں انکے مادہائے تاریخ بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ تاریخ سرفرازی خدمت مدار المہامی بہ نواب شمس الامرا امیر کبیر

(الف) وزیرِ مطلق شاہِ دکن امیر کبیر
۱۲۶۵ھ
(ب) شمس الامرا شد وزیر نواب
۱۲۶۵ھ

۲۔ تاریخ وفات نواب شمس الامرا امیر کبیر

(الف) شد امیر کبیر امیر ارم
۱۲۷۹ھ
(ب) دلا کوئی ایسا ریاضی نہیں
۱۲۷۹ھ

حضرت فیض نے ایک دفعہ امیر کبیر کی سالگرہ کی تقریب میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا جو ان کے عنفوان شباب کے مرتبہ دیوان میں موجود ہے۔ یہہ امر واضح رہے کہ ان کے کلام میں سوا اس ایک قصیدہ کے کسی بادشاہ یا امیر کی شان میں اور کوئی قصیدہ موجود نہیں ہے البتہ ان کے مطبوعہ دیوانوں میں ان کے نعتیہ قصیدے شامل ہیں۔ مدح امیر کبیر کے قصیدہ میں بھی کوئی ایسا شعر نظر سے نہیں گذرتا جو مبالغہ اور بے جا مدحت طرازی پر مبنی ہو۔ گویا یہہ قصیدہ اردو زبان میں اپنی قسم کا ایک ہی ہے اور چونکہ اُن کے مطبوعہ دیوانوں میں موجود نہیں ہے اس لئے یہاں اس کو تمام و کمال درج کیا جاتا ہے۔

قصیدہ در مدح امیر کبیر

خفا ہو لیوے جو تو ابرو میں ڈال گرہ — کبھی نہ کھول سکے ناخنِ ہلال گرہ

کروں نسیم کے صحنِ چمن میں ہاتھ قلم — کرے جو دانۂ شبنم کی پائمال گرہ

بہار خال جو دیکھیں کسی کے عارض پر — تو دلوں میں رشتۂ جاں میں ابھی ہلال گرہ

نہ روبرو ترے پھر آئیگا مہ کامل — جبیں پہ ڈال نہ اے یار خوشخصال گرہ

خطا ہی دوں تری آنکھوں سے میں اگر تشبیہ ۵ برنگ نافہ ہے یہاں دیدۂ غزال گرہ

ہوائے لطف تری چل کے صحنِ گلشن میں — کرے ہے وا کئی غنچوں کی بے سوال گرہ

خیال خال لبِ گلعذار ہے جب سے — پڑی ہے دامنِ دل میں بھی خال خال گرہ

تری ہی کشمکشِ لطف سے کھلی ورنہ — دلِ حزیں کی مری سخت تھی کمال گرہ

کہاں ہے فکر کے پیچے میں گوہرِ مضموں — ہوئی ہے وا مری ہاتھوں پڑی محال گرہ

سوادِ نقطۂ عشرت نظر کرے جو ترا — ۱۰ — رخِ بتاں کو نہ دکھلائے کوئی خال گرہ

مقابل اسکے درِ گوش کے ہوئی ہے نسیم — چراغ صبح کی اچھی نہیں نکال گرہ

پھر آج عقدہ کشا ہوئے موج کی انگشت — حباب اسلئے پھرتا ہے یہاں سنبھال گرہ

غلط ہے ہمسریٔ آفتاب یہاں اُس سے — کہ قرص ناخن پا ہے وہ بے مثال گرہ

شگوفہ عقدۂ سربستہ وا کرے اپنا — جو کھولے بندِ قبا کی وہ نونہال گرہ

جو زیرِ شانۂ دستِ کرم نہ آئے ترے — ۱۵ — رہے گی کاکلِ خوباں کی بال بال گرہ

کمندِ زلف سے تیری جو کر گیا پرواز — ہنوز بان ہما میں رہا وبال گرہ

حصول جب سے کیا نقدِ سرخروی کو — پھرے ہے غنچہ دکھاتا چمن میں لال گرہ

جو تیرے گھر میں برس گانٹھ کا ہوا جلسہ — ہوئی ہے گلشنِ امید کی نہال گرہ

برنگ دانۂ انگور دل پہ آبلے تھے — جب اپنی خاطرِ محزوں کا تھا ملال گرہ

حباب مے کی طرح بے دماغ ہیں لیکن — ۲۰ — ہمارے سر میں ہے اس چشم کا خیال گرہ

شراب ناک پئے ساغرِ بلور میں ہم — جو صبح چشم کی کھولے وہ ذی جمال گرہ

خجل ہو قطرۂ خوں سے تری وہ آب ہوا — دلِ گہر میں رہا اب تلک انفعال گرہ

بہجت زیب قبا تیری تکمۂ زرّین ستارۂ سحری دیوے کھول کھال گرہ

یہی ہے آرزوئے فیضؔ اے امیر کبیر ہزار سال تلک ہووے تیری سال گرہ

نواب سکندر جاہ کی وفات اور نواب ناصر الدولہ آصفجاہ رابع کی تخت نشینی کے وقت یعنی ۱۲۴۴ھ میں حضرت فیضؔ انچاس ۴۹ سال کے تھے اور علم و فضل اور شعر و سخن کی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ نواب ناصر الدولہ کی تخت نشینی کے مادہائے تاریخ نے حضرت فیضؔ کی تاریخ گوئی کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ انہوں نے اِن مصرعوں میں تاریخیں نکالی تھیں

ع (الف) مرد میداں سکندر ثانی (ب) رونق خاندانِ آصفجاہ
۱۲۴۴ھ ۱۲۴۴ھ

اس عہد سے قبل ہی شہزادہ مبارز الدولہ بہادر نے حضرت فیضؔ کے آگے زانوئے شاگردی طے کیا تھا۔ یہی مرشد زادہ نواب آصف جاہ ثالث کی اولاد میں سب سے زیادہ علم و فضل اور مذہب و دینداری کے دلدادہ تھے۔ اور ان کی افتادِ طبع کی تعمیر میں حضرت فیضؔ کو کافی دخل تھا مشہور ہے کہ نواب مبارز الدولہ بعد کو بعض وہابی علما کی ترغیب سے وہابیت کی طرف مائل ہو گئے تھے ممکن ہے کہ ان کا یہ رجحانِ طبع فیضؔ کی تعلیم و تربیت اور خیالات کا اثر ہو کیونکہ کہا جاتا ہے کہ عنفوانِ شباب میں وہ بھی علم و فضل و معلومات کے زور میں پیری مریدی اور تصوف کے خلاف تھے اور مشائخوں اور صوفیوں کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے بعد میں نواب ناصر الدولہ کے عہد حکومت میں جب پیر شاہ ابراہیم صاحب سے اتفاقاً دوچار ہوئے تو یکایک ذہنی انقلاب ہو گیا اور کتابوں کی دنیا سے نکل کر تصوف و عرفاں کی راہ اختیار کی اور آخر کار خود بھی ایک بڑے صوفی اور اہل اللہ ہو گئے۔

اس واقعہ کا تفصیلی حال نواب محمد کریم الدینخاں فرزند نواب مشرف جنگ فیاض نے اپنی اس یادداشت فیض میں جو راقم مضمون کی فرمائش پر قلمبند کی ہے جسطرح لکھا ہے اسکو نوٹ[1] میں بعینہ درج کیا جاتا ہے۔ انکے دیوان میں ابراہیم شاہ صاحب کی مدح میں کئی اشعار نظر سے گذرتے ہیں جنمیں سے بعض یہہ ہیں

کیا لکھوں میں وصف ابراہیم کا ۔۔۔ ہے وہ مرات احمد بے میم کا

ایک میں بھی عالم انکا سا نہیں ۔۔۔ گو یہاں عالم ہے ہفت اقلیم کا

کیا پتہ اپنا بتاؤں فیض میں ۔۔۔ ہوں چرن بردار ابراہیم کا

نواب مبارز الدولہ کے علاوہ نواب شمس الامرا امیر کبیر کے علم دوست اور شاعر مزاج صاحبزادہ نواب حافظ محمد بدرالدین خاں معظم الدولہ معظم الملک تمیز بھی حضرت فیض کے ارشد تلامذہ میں شامل تھے۔ یہہ نیک دل نوجوان اپنے استاد کے بڑے عقیدت مند اور چہیتے شاگرد تھے اور ہمیشہ استاد کو اپنی حسن نیاز مندی اور تحفہ تحایف اور نذرانوں سے

---

[1] حضرت فیض کی مریدی کا واقعہ بھی عجیب وغریب ہے کہتے ہیں کہ حضرت کو اس طرف مطلق رغبت نہ تھی بے علم مشائخین کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے ایک مرتبہ اپنے مکان کے باہر چبوترہ پر احباب اور تلامذہ کے مجمع میں چارجامہ پر تشریف فرما تھے راستہ سے ایک فقیر بہ حال تباہ پھٹے پرانے کپڑے اور میلی کچیلی گودڑی میں گذرے اتفاق کی بات کہ انہوں نے ان پر اور انہوں نے ان پر نظر ڈالی خدا جانے اس چار چشمی میں کیا راز و نیاز ہوئے اور اس نظر نے کیا اثر کیا کہ بے اختیار اٹھے اور فقیر صاحب کا ہاتھ چوما اور بہ منت لاکر بٹھایا اور انہیں کے مرید ہوگئے اسی واقعہ کی طرف غالباً اس شعر میں اشارہ کیا جاتا ہے ؎

تیر ترا سینے میں لگتے ہی ہیں ۔۔۔ آدمی تھا قبلہ نما ہوگیا

اس بزرگ کا نام ابراہیم علی شاہ تھا۔

خوش کیا کرتے تھے۔ اگرچہ حضرت فیض بے طمع اور آزاد منش شخص تھے لیکن انہوں نے اس شاگرد رشید کی مدح میں رطب اللسان ہیں حسب ذیل اشعار کو پڑھتے وقت یہہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہہ وہی فیض ہیں جنہوں نے نواب معظم الدولہ تمیز کے والد نواب امیر کبیر کے مدحیہ قصیدہ میں بھی کوئی تعریفی یا مبالغہ آمیز الفاظ نہیں لکھے ہیں البتہ اپنے چہیتے شاگرد کی تعریف اسطرح کی ہے

(الف)

رقم ہو کیسے عطائے معظم الدولہ — نہ یاں شمار ہیں تاروں کا جب خزینہ رہا
کرے کفاف جو داد و دہش کو فیض اُسکی — تہہ زمین تو نہ ایسا کہیں دفینہ رہا

(ب)

یہہ آرزو ہی رہے جب تلک خداوندا — مبارزان جہاں کے حساب میں تلوار
چلے بفرق عدوئے معظم الدولہ — جو ہے جناب شہ بوترابؑ میں تلوار

(ج) مداحئ معظم دولہ کے فیض سے — ہیں کتنے کچھ فصیح غزل خوانیوں میں ہم

اِس موقع پر خود معظم الدولہ تمیز کا وہ شعر بھی درج کرنے کے قابل ہے جس میں انہوں نے اپنے استاد کے فیضان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

خدا کا فیض ہی جاری ہیں یہہ دعوی کروں کیونکر — کسی کا شعر میرے شعر سے بہتر نہووے گا

شاعری کے علاوہ نواب تمیز خط ظفر میں بھی حضرت فیض کے شاگرد تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ناخن سے جو مرقع تیار کیا تھا اُس کے آخر میں حضرت فیض کا حسب ذیل قطعہ تاریخ بھی شامل ہے

از ناخنِ خود معظم الملک — آراست چوں ایں چنیں مرقع
اے فیض سنش بگفت مانی — ناخن بدلم زد ایں مرقع

جب آصف جاہ رابع نے ۱۲۷۳ھ میں رحلت کی اور نواب افضل الدولہ آصفجاہِ خامس تخت نشین ہوئے تو حضرت فیض کے تقدس اور قوتِ باطنی کا عام شہرہ تھا۔ اس وقت اُن کی عمر اٹھتر ۷۸ سال کی تھی اور لوگ اُن کو "اُستادِ کل" کے لقب سے مخاطب کرتے تھے۔

نواب ناصر الدولہ کی بے وقت وفات کا عام اہل ملک کی طرح ان پر بھی بڑا اثر ہوا تھا چنانچہ انہوں نے اس سانحہ کے متعلق کئی قطعات تاریخی لکھے ہیں جنمیں سے دو۲ کے مادہائے تاریخ یہ ہیں:۔

(الف) بخلدِ لم یزل آمد جنابِ ناصر الدولہ (ب) ناصر الدولہ بسیر جنت آمد از محل
۱۲۷۳ھ ۱۲۷۳ھ

نواب افضل الدولہ کی تخت نشینی کی تاریخ بھی بڑی اچھی نکالی ہے فرماتے ہیں ؎

رئیس حیدرآباد دکن فیض ہے نواب افضل الدولہ بہادر
۱۲۷۳ھ

حضرت فیض نواب افضل الدولہ کے قریب قریب آخری عہد تک زندہ رہے چنانچہ آخر زمانہ میں جب نواب میر محبوب علیخاں آصف جاہ سادس پیدا ہوئے تو حضرت فیض کی عمر اٹھاسی سال کی تھی انہوں نے اس محبوب بادشاہ کی ولادت کے کئی تاریخی قطعات لکھے جن میں حسب ذیل مادہائے تاریخ قابل ذکر ہیں۔

(الف) رہے یارب سلامت شہزادہ (ب) چراغ دکھن
۱۲۸۳ھ ۱۲۸۳ھ

اس طویل عرصہ یعنے عہدِ نظام علی خاں آصف جاہ ثانی سے پیدائشِ محبوب علیخاں آصف جاہِ سادس تک حیدرآباد جن سیاسی منازل سے گذر رہا تھا ان سب سے حضرت فیض واقف تھے خاصکر شمالی ہند کے واقعہ غدر ۱۸۵۷ء نے ان کو خاص طور پر متاثر کیا تھا انکو اندیشہ تھا کہ کہیں انگریز آیندہ حیدرآباد کو بھی نقصان نہ پہنچائیں اس زمانہ کے عام نقطۂ نظر کے لحاظ سے

وہ اس قوم کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور اپنے کلام میں جگہ جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً

ہے دشمنِ دکھن وہ کلہ پوش جس نے فیضؔ | غارت کیا ہے تختۂ ہندوستان کو
اپنی آتش بار آہیں دیکھ کر | بھاگ جائیں پلٹنیں انگریز کی
گیا مٹکف کسی بندر کے رستے | تری آمد اِدھر جو مارٹن تھی

آخری شعر عنفوانِ شباب کے کلام میں شامل ہے۔ اس میں حیدرآباد کے دو ریذیڈنٹوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلے مصرعہ میں سر چارلس مٹکاف کی طرف اشارہ ہے جو حیدرآباد کے گیارہویں ریذیڈنٹ تھے اور ۱۸۲۵ء تک یہاں قیام کیا تھا۔ انکے بعد چند روز کیلئے کپتان ایچ سی بیارٹ نے ریذیڈنٹ کے فرائض انجام دیئے کیونکہ سر چارلس مٹکاف کے جانشین ڈبلیو۔ بی۔ مارٹن کو حیدرآباد پہنچنے میں چند ہفتوں کی تاخیر ہوگئی تھی۔ مارٹن حیدرآباد میں ۱۸۲۵ء سے ۱۸۳۰ء تک ریذیڈنٹ رہے۔ مصرع ثانی میں انہی کا ذکر ہے۔ مصرع اولیٰ ہجو ملیح کی حد میں داخل ہے۔

شاعر اپنے زمانہ کا ترجمان ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے ماحول و زمانہ کے حالات اور سیاست کی کوئی جھلک اپنے کلام میں نہیں چھوڑنا چاہتا اور اس قسم کے واقعات کے اظہار کو نفسِ شاعری کے لئے کسرِ شان سمجھتا ہے لیکن اِس احتیاط کے باوجود اس کی زبان یا قلم سے غیر ارادی طور پر ایسے شعر نکل جاتے ہیں جن کے متعلق وہ یہ محسوس بھی نہیں کرسکتا کہ زمانۂ مستقبل میں یہ اشعار اُس کے قلب و دماغ کی کیفیات و رحجانات کی چغلی کھائیں گے اور اُن اسرار کو فاش کردیں گے جنکے چھپانے کی اُس نے ہمیشہ کوشش کی تھی۔ متذکرہ بالا اشعار کے علاوہ جن میں سیاستِ وقت کی جھلک نظر آتی ہے حضرت فیضؔ کے کلام سے اور باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔

یہہ معلوم ہے کہ ان کے عہد سے نصف صدی بیشتر ہی سے حیدرآباد میں شمالی ہند کے شعرا کی آمد شروع ہو گئی تھی اور حیدرآبادی شاعروں نے اپنی زبان و محاورہ کو غلط قرار دیکر ان نو وارد شاعروں کی شاگردی شروع کردی تھی چنانچہ خود فیضؔ بھی حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی تلمیذ حضرت خواجہ میر دردؔ کے شاگرد ہوئے تھے لیکن اس تعلق کے باوجود وہ شمالی ہند سے آئے ہوئے شاعروں کے دعوائے زباندانی کو بغیر تحقیق کے تسلیم کرنا اور حیدرآبادی شعرا کے کلام کو بلا وجہہ حقارت کی نظر سے دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ حاضر کی طرح اُس زمانہ میں بھی یہہ احساس اہلِ ملک کے جذباتِ خودداری کا جزوِ اعظم تھا ورنہ فیضؔ جیسا سنجیدہ مزاج اور پاک باطن شاعر جذبۂ وطن پرستی اور اہلِ دکن کے اہلِ زبان ہونے کا اس شد و مد سے اظہار نہ کرتا۔ اُن کے بعض شعر یہ ہیں ؎

رشکِ فردوس چمن ہے اپنا حیدرآباد وطن ہے اپنا

حیدرآباد دکن میں ہیں ہم چین سے اپنے وطن میں ہیں ہم

معشوق گورے گورے دکن میں ہیں آگئے ہیں لکھنؤ گیا نہ فرنگی محل گیا

شعرا ہند کے سب فیضؔ جنہیں کہتے ہیں حیدرآباد دکن خاص وطن ہے انکا

نہ کریں اہلِ زباں کی تقلید کس لئے صاحبِ زباں ہیں ہم

آخری دو شعروں میں ہندوستان کے شعرا کی دکن میں مسلسل آمد اور اہلِ دکن کو غیر اہلِ زبان سمجھکر تقلید پر مائل کرنے کی طرف طنزاً اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت فیضؔ جیسی باکمال اور صاحبِ ثروت ہستی کا یہہ طعنہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انہیں کسی سے رشک تھا نہ حسد

اور نہ کسی شاعر کی قدر افزائی اور ملازمت سے سروکار؟ وہ فکرِ معاش سے بے نیاز رہے
اُن کے دادا مولوی میر رحمت اللہ اور والد مولوی میر امیر الدین دونوں اربابِ فضل و کمال
اور صاحبانِ منصب و ثروت تھے۔ اِس خاندانی وجاہت کے علاوہ عنفوانِ شباب سے
حضرت فیض کی کافی قدر و منزلت تھی اولاً نواب مبارز الدولہ کی تعلیم انکے تفویض ہوئی اور
پانسو روپئے مشاہرہ مقرر ہوا اس کے علاوہ مسلسل اُن کے مدارج و مناصب میں اضافہ ہوتا رہا
فیاضِ ازل نے حضرت فیض کو دولتِ باطنی یعنے علم و فضل کے ساتھ عزت و ثروت سے بھی
نوازا تھا اس کا اندازہ ان کے ایک خاص شاگرد بہاری لال رمز کی تحریر سے ہوتا ہے۔
یہہ خود رمز کی لکھی ہوئی یادداشت ہے جو اس وقت زیر نظر ہے اپنے حالات کے ضمن میں اپنے قلم
سے اپنے استاد و مرشد کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:۔

"برائے تعلیم مبارز الدولہ بہادر مرشد زادۂ والئ دکن بتقرر پانصد روپیہ ماہانہ مقرر شد
من بعد برائے تعلیم بدر الدین خاں بہادر صاحبزادۂ نواب شمس الامرا امیر کبیر اولیٰ
سہ صد روپیہ ماہانہ، بعد چندے برائے شہ یار الملک بماہ مذکور، و بعد در زمانۂ سراج الملک و
سہ سالار جنگ بہادر خرچ دو صد روپیہ بلا اقبال ترقی معاش و خدمت بیاد آلہی و
عزلت نقدِ عمر صرف نمودہ"

حضرت فیض کے صاحبزادوں کو بھی منصب مقرر تھا اور استاد زادہ و مرشد زادہ ہونے کی
حیثیت سے اِن سب کے خاص اعزاز تھے اور عمر بھر ان کی قدر و منزلت ہوتی رہی۔ غرض
منصب و تنخواہ و اعزاز کے لحاظ سے حضرت فیض کی امیرانہ زندگی تھی مگر انکے ذاتی اخراجات

وحالات زندگی صوفیائے کرام کی طرح نہایت سادہ وصاف تھے۔ اُن کے متعلق مشہور ہے

جیسا کہ محبوب الزّمن میں لکھا ہے:۔

"مزاج میں کسر نفسی زیادہ تھی۔ تکلف ظاہری سے متنفر تھے۔ مکان میں فرش بوریا

ہوتا تھا اسی پر امرا و غربا آتے تھے اور بیٹھتے تھے۔" (صفحہ ۹۱۶)

اس بیان کی تصدیق محمد ہدایت اللہ خاں بہادر رو آج جاگیردار و نائب معتمد بارگاہ خورشید جاہی

کی اس تقریظ سے بھی ہوتی ہے جو دیوان فیض مرتبہ مظفر الدین خاں مزاآج کے ساتھ شایع ہوئی ہے

اس میں لکھا ہے۔ "بالجملہ در اسباب ظاہری تکلف نمی خواست و فرشِ آں بے ریا بوریائے بود کہ ہر کہ

از امیر و غریب می آمد بر آں می نشست"۔ صفحہ (۱۰)

حضرت فیض محتاجوں اور مستحقوں کی ہر طرح کی امداد کرتے تھے۔ جو انکے یہاں آتا خالی ہاتھ واپس نہ جاتا تھا

اسکے علاوہ اپنی طبیعت کے خلاف سفارشوں سے بھی دریغ نہ کرتے تھے چنانچہ (انکے معاصر حکیم غلام حسین خاں نے

گلزار آصفیہ میں اس بارے میں خاص طور پر زور دیا ہے کہ:۔

"در بر آمد کار ارباب احتیاج بدمے یا درمے یا قدمے یا قلمے مستمائے زمانہ اند کہ ایں مقدمہ خیلے مشکل تر

است۔ علی الخصوص دریں وقت کہ پدر برائے پسر زبان سعی و کوشش دراز نمی کند تا برائے غیر چہ کند" (صفحہ ۴۲۴)

حضرت فیض کی حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور بدیہہ گوئی بھی بہت مشہور تھی۔ محبوب الزمن

اور دیوانِ فیض کی تقریظوں وغیرہ میں اس سے متعلقہ بعض قصے درج ہیں جن میں سے

چند کو اختصار کے ساتھ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) ایک دفعہ ایک مشائخ صاحب انکی ملاقات کو آئے۔ اثنائے تقریر میں خشمدیدہ ہو کر

شیخیت و تعلّی سے فرمایا کہ :-

اگر تم دیکھنا چاہتے ہو تو میں خود کو ابھی شیر کی شکل میں ظاہر کر دوں۔ مولانا نے مسکرا کر جواب دیا کہ شیر حیوان ہے بہتر ہے کہ آپ انسان ہیں۔ اِس برجستہ جواب پر شیخ صاحب کو خجل ہونا پڑا۔

(۲) ایک روز ایک بد تہذیب شخص نے حضرت فیض کا مضحکہ اڑانے کی خاطر سوال کیا کہ جناب کے تخلصِ خاص یعنے فَیض کا قافیہ کیا ہوگا۔ مولانا نے فوراً جواب میں یہہ مصرع پڑھ دیا :-

آں کہ بنائے وجودتست

(۳) آپ کے ایک شاگرد میر شجاعت علی کرّم نے عرض کیا کہ پیر و مرشد ایک مصرعہ کہا ہے :-

ع دانے نہ آپ سبحہ سُمرن کے دیکھئے۔ مگر اس کا مصرعہ ثانی دستیاب نہیں ہو رہا ہے۔

حضرت فیض نے بلا تامل ارشاد فرمایا ع منکے ڈھلے ہوئے مری گردن کے دیکھئے۔

(۴) مولوی احمد علی خلف اکبر علیخاں فصاحت جاہ نے ایک مصرعہ سکندر طالع جمشید سطوت بہجگیر دریافت کیا کہ یہہ مادہ تاریخی ہے اس میں لفظ طالع کے ساتھ اضافت جائز ہے یا نہیں۔

حضرت فیض نے اپنے شاگرد خاص نواب اشرف جنگ فیاض کو اشارہ کیا کہ اسکے جواب میں لکھدیں کہ

کسرِ طالع دلیل کسرِ شانِ فصاحت است از انکہ حاصل سکندر طالع جملہ است و جملہ موصوف نمی شود۔ کما لا یخفی علی الفصیح والبلیغ۔ و دیگر ایں کہ محل مقتضی وصل است وقائل در پے فصل۔ و ایں ہم قباحت است۔ اگر مصرع بایں طور شود ع سکندر طالع و جمشید طینت۔ اولیٰ و ہموافق مقصود و خالی از عیب بود۔

اسی طرح کی اور بذلہ سنج مثالیں پیش نظر ہیں مگر ان سب کا اس جگہ پیش کرنا باعث طوالت ہے

یہہ امر واضح ہے کہ حضرت فیضؔ بڑے بذلہ سنج اور بدیہہ گو تھے اور یہہ خصوصیات ان کے دیگر

کمالات کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں ان کی غیر معمولی ذہانت اور جودت طبع ان کے

خطِ ظفر سیکھنے کے واقعہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ حیدرآباد میں خط ظفر کے موجد مانے جاتے ہیں

اور اُن کی توجہہ سے اکثر نوجوانوں نے بھی یہہ کمال سیکھ لیا تھا۔ ایک ولایت زا ماہر فن

خطِ ناخن کی تحریریں دیکھ کر مولانا بڑے خوش ہوے اور اس سے خواہش کی کہ یہہ کمال انکو

بھی سکھادے۔ مگر وہ اس میں بخل کرتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ حیدرآباد میں سوا اسکے کوئی اور

اس سے واقف ہو۔ حضرت فیضؔ نے خود ہی اس کا گر معلوم کر لیا اور مشق شروع کی چند روز

میں ایسا کمال بہم پہنچایا کہ اُن کی شہرت خود اس ولایتی ماہر فن تک بھی پہنچ گئی یہہ سنکر

ایک روز وہ ایک قطعہ لیا ہوا مولانا کے یہاں پہنچا۔ مولانا وہ قطعہ کاغذ لیکر مکان میں داخل

ہوئے اور تھوڑی دیر میں بالکل ویسا ہی قطعہ تیار کر کے باہر تشریف لائے۔ اجنبی ایک

ہی طرح کے دو قطعے دیکھکر حیران رہ گیا وہ تمیز ہی نہ کر سکا کہ اس کے ناخن کا قطعہ کونسا ہے

اور مولانا کا کونسا۔ اس کو بڑا افسوس رہا کہ کاش میں مولانا کی استادی کا شرف حاصل کر لیتا

مولانا کے ناخن کے متعدد قطعات نواب مشرف جنگ فیاض کے کتب خانہ میں حال حال تک

موجود تھے مگر افسوس ہے کہ اس مضمون کی تحریر کے وقت دستیاب نہ ہوسکے ورنہ اسکا عکس

شایع کردیا جاتا۔ البتہ مولانا کے ایک خاص شاگرد حافظ بدرالدین خاں نواب معظم الملک تمیز

کا مرقع خطِ ظفر اس وقت تک نواب معین الدولہ بہادر کے کتب خانہ میں موجود ہے جسکے چند

قطعات کے عکسی بلاک مرقع سخن جلد اول و دوم میں شایع ہو چکے ہیں اس مرقع کے لئے

مولانا نے جو قطعہ تاریخ لکھا تھا اور غالباً خود اپنے ناخن سے مرقع نمبر ۲ کے آخر میں درج کیا تھا وہ اسی مضمون میں اوپر گذر چکا ہے۔ اسکا مادۂ تاریخ نہایت لاجواب ہے یعنے۔ ع

ناخن بدلم زد ایں مرقع
۱۲۵۹ھ

حضرت فیض بڑے پُر گو شاعر تھے اور تقریباً اڑسٹھ سال اُردو ادب اور شعر شاعری کی خدمت انجام دی۔ انہوں نے بائیس سال کی عمر میں ایک دیوان مرتب کر لیا تھا جس سے ظاہر ہے کہ بیس ۲۰ سال کی عمر سے یا اس سے قبل ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اُن کے ابتدائی دیوان چشمۂ فیض کا ایک شعر پہلے نقل کیا جا چکا ہے جس میں عمر (۲۲ سال) کا ذکر کیا ہے غرض عنفوان شباب سے وقت رحلت تک وہ برابر شعر کہتے رہے۔ نواب میر محبوب علیخاں آصفجاہ سادس کی ولادت کی تقریب میں انہوں نے جو متعدد اعلےٰ پایہ قطعات تاریخی لکھے وہ ان کی وفات سے پانچ چھ ہفتے قبل کی تصنیف ہیں۔

حضرت فیض نے جس وقت شعر و سخن کا آغاز کیا حیدرآباد میں شاہ تجلی متوفی (۱۲۱۵ھ) لچھمی نارائن شفیق (۱۲۱۵ھ) شیر محمد خاں ایمان (۱۲۲۰ھ) اور محمد صدیق قیس (۱۲۳۰ھ) جیسے دکنی اساتذۂ سخن موجود تھے۔ انہی کے پیدا کئے ہوئے ادبی ماحول میں فیض کی شاعری کی نشو و نما ہوئی۔ اور ابھی ان کا عنفوان شباب ہی تھا کہ حیدرآباد کے اکثر بلند پایہ شاعروں نے انتقال کیا تعجب ہے کہ ان کے بعد کوئی ایسا شاعر حیدرآباد میں (فیض کے علاوہ) پیدا نہ ہو سکا جو اُن کی جگہ لیتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ خود فیض کی ترقی اور شہرت بھی ایک معجزہ سے کم نہیں ہے جب دیکھا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں حیدرآباد میں شمالی ہند کے

اکثر اساتذۂ سخن مثلاً شیخ حفیظؔ، شاہ نصیرؔ، آفاقؔ، شہرتؔ، مرہونؔ، صفاؔ، وصفیؔ اور شہید وغیرہ موجود تھے۔ اور ان سبھوں نے یہاں کے درباروں اور مشاعروں میں اپنی شاعری اور زباندانی کا رنگ جما رکھا تھا۔ ان اہل زبان شعرا کے مقابلہ میں حضرت فیضؔ کا اک اپنی مستقبل جگہ پیدا کر لینا اور قبول خاطر و لطف سخن میں روز بروز ترقی کرنا ان کے غیر معمولی کمال اور قادر الکلامی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ مشہور ہے کہ ایک دفعہ شاہ نصیرؔ نے مہاراجہ چندو لال کے مشاعرہ میں اس نوجوان کا کلام سنکر بے تحاشہ کہدیا تھا کہ:۔

"یہہ آفت کا پتلا ہے، ہونہار ہے عنقریب رنگ دکھلائے گا"

حضرت فیضؔ کا اپنے ان معاصر شعرائے دہلی و لکھنو کے کلام سے متاثر ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ ان کے کلام میں شاہ نصیرؔ کا رنگ خاص طور پر جھلکتا ہے اور وہ بھی سنگلاخ زمینوں اور مشکل سے مشکل قافیوں اور ردیفوں کے استعمال کا التزام ضروری سمجھتے ہیں۔ حیدرآباد کی شاعری کے لئے یہہ امر نقصان دہ ثابت ہوا کہ اس زمانہ میں اکثر ایسے ہی شاعر شمالی ہند سے دکن آئے جو خیال اور مطالب و معانی و زبان سے زیادہ ضلع جگت اور صنعتِ ایہام پر زور دیتے تھے۔ اگر حفیظؔ، آفاقؔ، مشتاقؔ اور شاہ نصیرؔ کے بجائے فیضؔ میر تقی میرؔ کے رنگ پر چلتے تو یقین ہے کہ ان کا کلام اس سے زیادہ مقبول ہوتا۔ میرؔ کے انتقال کے وقت فیضؔ کی عمر تیس ۳۰ سال کی تھی اور ان کا پہلا دیوان اس سے کئی سال قبل مرتب ہو چکا تھا۔

حضرت فیضؔ کے چار اردو دیوان مرتب ہوئے تھے۔ پہلا دیوانِ چشمۂ فیض تو

اس وقت موجود ہے لیکن بقیہ تین دیوان اب تک دستیاب نہو سکے۔ چشمۂ فیض کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ یہہ اس لئے اہم ہے کہ اسکا کلام مطبوعہ دیوانوں میں شامل نہیں ہے اور اسکے مطالعہ سے اُن کی ابتدائی زندگی اور خیالات کے متعلق بعض ضروری معلومات حاصل ہوتی ہیں جن سے اس مضمون میں جگہ جگہ استفادہ کیا گیا ہے حضرت فیض کے بقیہ تین قلمی دواوین کا ذکر اسی چشمۂ فیض کے حاشیوں سے ملتا ہے جن کا ذکر گذر چکا ہے۔ اگر یہہ دیوان بھی مل جائیں تو یقین ہے کہ ہمارے معلومات میں اور اضافہ ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہہ دیوان ان کی وفات کے بعد یا تو کسی طرح تلف ہوگئے یا کسی شاگرد یا معتقد کے یہاں رہ گئے کیونکہ بعد میں مختلف شاگردوں کی طرف سے جو ۲ دیوان طبع کئے گئے ان کے مرتبوں نے ان دواوین کا کہیں ذکر نہیں کیا۔

حضرت فیض کا پہلا مطبوعہ دیوان گلدستہ عرفان کے نام سے سنہ ۱۳۰۰ھ میں شایع ہوا۔ اُس کے مرتب خواجہ جمال الدین مطلب تھے جنہوں نے اس کام میں اور دو اصحاب حمید الدین اور سید احمد سے بھی مدد لی۔ مطلب مثنوی خواں تھے اور بعض تلامذہ فیض ان کو "جانشین خاص حضرت فیض" تصور کرتے ہیں جیسا کے اس دیوان کی تقریظ سے ظاہر ہے۔ اس گلدستہ عرفان کی طباعت وغیرہ کے سلسلہ میں نواب معز جنگ۔ خواجہ عالم علی خاں (جمعدار عرب) اور شجاعت خاں جری (مددگار نواب اکرام جنگ) نے مالی امداد و اعانت کی تھی۔ یہہ دیوان بڑی تقطیع کے ۴۵۶ صفحات پر مشتمل ہے اس میں قریب قریب ساڑھے سات ہزار اشعار جمع کئے گئے ہیں۔ اس کے آخر میں شجاعت خاں جری کی تقریظ کے علاوہ حکیم محمد فاضل

حکیم محمود علی جفاؔ، غلام محبوب خاں محبؔ اور خواجہ جمال الدین مطلبؔ کے قطعات تاریخی بھی درج ہیں۔

اس دیوان کی اشاعت کے چند ماہ بعد ہی ۱۳۰۱ھ میں حضرت فیضؔ کا ایک اردو دیوان مرقع فیض بھی شایع ہوا۔ جس کو حضرت فیضؔ کے فرزندوں سے اجازت لے کر حکیم منظفر الدین خاں مزاجؔ اور نواب مشرف جنگ قیاضؔ نے مرتب کیا اور اول الذکر کے فرزند حکیم منور الدین خاں علاجؔ نے شایع کیا تھا۔ اس کی ترتیب اور تقطیع وغیرہ گلدستہ عرفاں سے بہتر ہے اور غلطیاں بھی کم ہیں۔ اس میں ۴۸۰ اردو کے اور ۳۶ فارسی کے جملہ ۵۱۶ صفحات ہیں۔ اشعار کی تعداد تقریباً اتنی ہی ہے البتہ اس کی بعض تقریظیں نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہیں۔ ان میں منور الدین خاں علاجؔ ہدایت اللہ خاں رواجؔ اور منظفر الدین خاں مزاجؔ نے حضرت فیضؔ کے متعلق ضروری معلومات قلمبند کردی ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد شعرا کے قطعات تاریخی بھی شامل ہیں جن میں احمد علی قاضیؔ، عبدالعلی طپشؔ، کاظم علی شعلہؔ، انور خاں الفتؔ، عبداللہ عجبؔ، عبدالقیوم حفظؔ، منظفر الدین خاں مزاجؔ، میر احمد علی عصرؔ، عباس حسین خاں شمشیرؔ، محمد علی تخشیؔ کے علاوہ تلامذہ عصرؔ میں آصف یاور الملک وزیرؔ، ناصر شرفؔ، عشقؔ اور تلامذہ مزاجؔ میں قیاسؔ، خطابؔ، معزؔ، دماغؔ، سیفؔ، رواجؔ، اور علاجؔ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

گلدستہ عرفاں کی موجودگی میں اس دیوان کو شایع کرنے کی ضرورت اس کی تقریظ میں ہدایت اللہ خاں رواجؔ نے اس طرح ظاہر کی ہے :۔

"درین زماں شہرت طبع دیوان مولانا گوش خورد و زماں و زمانیاں شدہ، جائے عمداً بلالحاظ رفع غلطی کتابت دیوان مولانا بہ تقطیع نازیبا و خط نادرست، بطبع نامطبوع درآمدہ، واکثرجا مطلب فوت شدہ، امید از ناظرین بانصاف و شائقین سینہ صاف آنست کہ ہر دو دیوان راچشم انصاف کہ خیرالاوصاف است باعتبار حسن ترتیب و تصحیح بلیغ، و تطبیع ملحوظ فرمودہ شرط حق، پسندی از دست نخواہند داد"

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فیض کا بہت سا کلام یا تو تلف ہو گیا ہے یا انکے شاگردوں اور معتقدوں کے دواوین میں شامل ہے ورنہ ایک ایسے پُرگو شاعر کا کلام جس نے اڑسٹھ سال شعر و شاعری میں گذار دیئے چار سے زیادہ دواوین پر مشتمل ہوتا۔ اس کے علاوہ ایسے کلام کے بھی وافر نمونے دستیاب ہوتے جو مطالب و معانی کے لحاظ سے بے نظیر ہوتا اور جس میں محض زبان و محاورہ کی خوبیوں اور نزاکتوں کو امتیاز حاصل نہ ہوتا۔ ایسے شاعر جو محاورہ بندی اور زبان کی خوبیوں اور لغات کا اپنے کلام میں زیادہ لحاظ رکھتے ہیں اور اپنی شاعری کو خدمت زبان کے لئے وقف کر دینا چاہتے صاف اور پاکیزہ اشعار کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور جب کبھی قادر الکلامی کی وجہہ سے ایسے شعر نکل جاتے ہیں جن میں زبان و محاورہ یا صنایع و بدایع کے لحاظ سے کوئی خاص ندرت نہ ہو تو انکو اپنے شایان شان نہ سمجھکر اپنے تلامذہ کو دیدیتے ہیں۔ یہہ امر یقینی ہے کہ حضرت فیض نے اپنا اس قسم کا کلام اپنے تلامذہ یا فرزند کو دے دیا تھا اور اس طرح سے اُن کے کلام کا بہت سا حصہ جو زمانہ مابعد میں انکی شہرت قایم رکھنے میں ممد و معاون ہوتا یا مطالب و معانی پر نظر رکھنے والوں کی تشفی کر سکتا

ان کے دواوین سے خارج ہو گیا۔ اردو زبان کی تاریخ میں ہر جگہ اور ہر وقت یہی ہوتا رہا ہے
کہ زبان و محاورہ کا خیال رکھنے والے شاعر (مثلاً سوداؔ۔ انشاؔ۔ ذوقؔ) اپنی زندگی میں
قدر و منزلت حاصل کرتے رہے لیکن ان کے بعد جب اُن کا کلام پڑھا جاتا ہے تو پڑھنے والوں کو
وہ لطف حاصل نہیں ہو سکتا جو خود شاعر کے زبان سے سننے والوں کو حاصل ہوا تھا۔ اسی طرح
جو شاعر مطالب و معانی پر زور دیتے ہیں وہ اپنی زندگی میں اتنا مشہور نہیں ہوتے جتنا بعد میں
ہوتے ہیں۔ اور زمان و مکان کا یہ فرق جتنا زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی ان کی شہرت
بڑھتی جاتی ہے۔ میرؔ اور غالبؔ کی مقبولیت میں یہی راز مضمر ہے۔

حضرت فیضؔ نے زبان و محاورہ پر جو زور دیا ہے اس کا ایک سبب تو شاہ نصیرؔ اور
آفاقؔ جیسے شعرا کا اثر ہے جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ
ان کے زمانہ میں شمالی ہند کے متعدد شعرا حیدرآباد میں موجود تھے جو حیدرآبادی شاعروں
کو اہلِ زبان نہیں سمجھتے تھے اور انکے کلام کو زبان کے لحاظ سے کم درجہ کا قرار دیتے تھے۔
ان کے مقابلہ میں حضرت فیض یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ حیدرآبادی شاعر بھی شمالی ہند
کے شعرا کے برابر زبان و محاورہ کا استعمال جانتے ہیں۔ اپنے اس مقصد میں وہ بڑی حد تک
کامیاب بھی ہوئے۔ کیونکہ ان کے کلام کو اہل شمال نے بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا انکے
دیوان کی تقریظ میں اس بارے میں ہدایت اللہ خاں رواج نے لکھا ہے کہ:۔

”در سروش سخن کہ افسانہ ایست از صاحب زبان شاگردِ غالبؔ بر موقعے

شعر مولانا درج است“ ؎ نمک چھڑکا گیا اچھا ہوا فیضؔ دہانِ زخم اب تک بے مزا تھا

"حاصل کلام ہندیاں ہم کلام خود کلام فیض التیا مش راجا دادہ اند"
(صفحہ ۱۱۰)

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت فیض کا کلام صحتِ زبان اور محاورہ بندی کی وجہہ سے کافی مشہور ہوا اور اس خصوصیت نے ایسی شہرت پائی کہ ان کے مخالفین نے بعض ایسے شعر خود لکھکر ان سے منسوب کردئے جس میں کوئی محاورہ طنزاً استعمال کیا گیا ہے۔ اور چونکہ حضرت فیض کی یہہ خصوصیت بہت مشہور تھی اس لئے اُن کے معتقدین بھی اس قسم کے اشعار کو انہی کا سمجھتے تھے۔ چنانچہ نواب کریم الدین خاں فرزند مشرف جنگ فیاضؔ نے لکھا ہے کہ

"صاحب گلزار آصفیہ نے حضرت فیضؔ کا ذکر علما اور شعرا کے ضمن میں علحدہ علحدہ کیا ہے چند شعر بھی نموتاً لکھے ہیں جن میں ایک یہہ ہے ؎

"سرِ رہ گالیاں کھاتے کھڑے ہو   ارے میاں فیضؔ کیا چکنے گھڑے ہو

میرے پاس گلزارِ آصفیہ کی جلد ہے جس میں حضرت والد مغفور نے اپنے قلم سے یہہ نوٹ تحریر فرما دیا ہے:۔ یہہ شعر حضرت موصوف کا نہیں ہے۔ خود میں نے حضرت فیضؔ سے اسکی تصدیق کرلی ہے۔"

اس سلسلہ میں ایک اور واقعہ کا اظہار نامناسب نہو گا کہ حضرت فیضؔ کے حیدرآباد کے معاصرین میں حیدر حسین خاں حیدرؔ ایک مشہور استادِ سخن اور صاحب ثروت تلامذ تھے۔ ان کے تلامذہ کا بھی ایک بڑا گروہ تھا جن میں سید عبداللہ حسینی افسرؔ، حافظ انوار اللہ انورؔ، اور مظفر الدین معلےؔ قابل ذکر ہیں۔ تلامذہ حیدرؔ نے بعض مشاعروں میں فیضؔ اور ان کے تلامذہ پر چوٹیں بھی کی تھیں لیکن ایک دفعہ کسی مشاعرہ میں حضرت فیضؔ اور جناب حیدر دونوں موجود تھے

اور مؤخر الذکر کے ایک نوجوان شاگرد نے جب اپنی غزل میں ایک عامی محاورہ باندھ کر حضرت فیض پر چوٹ کرنے کے لئے یہ مصرعہ پڑھا کہ ع فیض ہے جوتیوں میں حیدر کی تو حضرت فیض سرو قد کھڑے ہوئے اور اُس نوجوان کو جھک کر سلام کیا۔ اس واقعہ کا حیدر اور اُن کے تلامذہ پر اتنا اثر ہوا کہ اس وقت سے طعن و تعریض بند ہو گئی اور وہ بے باک شاعر تمام عمر اپنی اِس بے ادبی پر نادم رہا۔

زبان و محاورہ بندی کے علاوہ کلام فیض کی دوسری اہم خصوصیت تصوف و عرفان کی جھلکیں ہے۔ ان کے آخری دور کے کلام میں یہہ رنگ بہت گہرا ہے اور بعض شعر تو صاف طور پر اپنے لکھنے والے کے اہل اللہ اور صاحب باطن ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ اِن کی غزلیں مجالس سماع میں خاص کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ خاصکر حسب ذیل شعر بہت مشہور ہیں

کریں ہم کس کی پوجا اور چڑھائیں کسکو چندن ہم
صنم ہم دیر ہم بت خانہ ہم بت ہم برہمن ہم

درو دیوار ہے نظروں میں اپنی آئینہ خانہ
کیا کرتے ہیں گھر بیٹھے ہی اپنا آپ درشن ہم

محبت ہے تو اپنے سے عداوت ہے تو اپنے سے
ہیں آپ ہی دوست اپنے ہم ہیں آپ ہی اپنے دشمن ہم

ہوا اے فیض معلوم ایک مدت میں ہمیں تھے وہ
جپا کرتے تھے جسکے نام کی دن رات سمرن ہم

حضرت فیض فارسی کے بھی ایک بلند پایہ شاعر تھے اور زیادہ تر حافظ کے رنگ میں کہا کرتے تھے۔ اُن کے اردو دیوان کے آخر میں ڈیڑھ ہزار شعر فارسی کے بھی شایع کئے گئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اتنا ہی فارسی کلام مرتبین کو دستیاب ہو سکا کیونکہ ان کا فارسی دیوان چوری گیا تھا۔ چنانچہ مظفر الدین خاں مزاج اپنی تقریظ میں رقمطراز ہیں:—

"دیوانِ آنحضرتِ فارسی ازاں بدستِ حوادثِ روزگار سرقت شعار افتاد کہ نشانے

ازاں بدست نیامد۔ بعدش غزلیات و اشعاریکہ فراہم شدہ بود با دیوانِ اُردو

بحلیہ طبع جلوہ ظہور نمود۔"

فیضؔ کے موجودہ فارسی کلام میں (۷۰) غزلوں (۵۷) رباعیوں اور (۷) نعتیہ قصیدوں کے

علاوہ جامیؔ و حافظؔ کی غزلوں پر مخمسات اور مثلثات نیز متعدد قطعات تاریخی بھی شامل ہیں

بہت سی فارسی غزلیں نئی بحروں میں لکھی گئی ہیں جو خود مصنف کی ایجاد کردہ ہیں۔ ان

غزلوں پر مرتب دیوان نے نئی بحروں کے نام اور وزن وغیرہ بھی درج کردیا ہے۔

مثال کے طور پر اس قسم کی چند بحریں اور غزل کا ایک ایک شعر درج ذیل کیا جاتا ہے۔

۱۔ بحر مطول مثمن سالم فرع طویل۔ ارکان او مفاعیلن فعولن مفاعیلن فعولن مستخرجہ صاحب دیوان

مطلع۔ رخ جاناں چہ باشد مقابل با دل ما ۔۔۔ بود مانندِ عنقا چہ عالی منزل ما

۲۔ بحر مشابہ مثمن سالم فرع مضارع۔ ارکانِ او فاع لاتن مفاعیلن فاع لاتن مفاعیلن چار بار

مستخرجہ صاحب دیوان۔

مطلع۔ شرف من چہ جی پرسی بحث ناقص تمام کرد ۔۔۔ بادہ با تو حلال شد آب بے تو حرام شد

۳۔ بحر بدیع مسدس سالم فرع سریع۔ ارکانِ او مفعولات مستفعلن مستفعلن شش بار مستخرجہ صاحب دیوان

مطلع۔ ہمدم با تو برا امکاں شاہی شد ۔۔۔ در غم بے تو تنتویش چہ ماہی باشد

۴۔ بحر مجدد مسدس سالم فرع جدید۔ ارکانِ آں مستفع لن فاعلاتن فاعلاتن شش بار مستخرجہ صاحب دیوان

مطلع۔ آرام ما عارض دلجوئے او باشد ۔۔۔ بہر ام ما چشم بر جادوئے او باشد

فارسی غزلوں کے آخر میں بھی قطعات و مصرعہ ہائے تاریخی درج ہیں جو ڈیڑھ سو سے زیادہ ہیں۔ استخراج تاریخ میں فیض کو خداداد ملکہ حاصل تھا۔ دکن کے کسی اور شاعر نے اتنی تاریخیں نہیں نکالیں چنانچہ صرف خاندان امیر کبیر ہی سے متعلق انہوں نے پانچ ہزار تاریخیں استخراج کی تھیں۔ اسکے متعلق اسی خاندان کے ایک ملازم اور وابستہ رواج نے لکھا ہے کہ

"در استخراج تواریخ ملکۂ میداشت کہ عقل از رسائیش فرومی ماند مصرعہائے تواریخ تولد صرف در خاندان امیر کبیر پنجہزار فرستادہ و داد سخن پروری دادہ۔ ہر کہ تاریخ می خواست فی الوقت بنامش نوشتہ می داد۔" (مرقع فیض صفحہ ۱۰۸)

خود تاریخیں استخراج کرنے کے علاوہ دوسروں کے لئے بھی اس کا ایک آسان طریقہ ایجاد کر کے شایع کر دیا تھا جو جدول اور دائرہ لولبی کے نام سے موسوم اور مشہور ہے۔ اور یہہ دیوان میں بھی شایع کر دیا گیا ہے۔ جو اصحاب اس فن میں کمال حاصل کرنا چاہتے ہوں اس جدول فیض اور دائرہ لولبی کا ضرور مطالعہ کریں۔ اس کے ذریعہ سے ایک معمولی فہم کا انسان بھی آسانی کے ساتھ مادۂ تاریخ یا مصرعہ تاریخ موزوں کر سکتا ہے۔

دواوین اردو و فارسی کے بعد رسالہ فیض جاری کا ذکر ضروری ہے جو خالق باری کے طرز پر بشکل مثنوی لکھا گیا تھا۔ نواب شمس الامرا امیر کبیر کے قائم کئے ہوئے مدرسوں میں پڑھانے کے لئے اس قسم کی کتاب کی ضرورت تھی چنانچہ انہی کی فرمایش پر ۱۲۵۶ھ میں یہہ رسالہ مرتب کیا گیا اور انہی کے مطبع میں چھپا تھا۔ اس کے آخر میں لکھا ہے "موافق عدد نام مولوی شمس الدین محمد کے چھ سو انیاسی بیت پر سوائے دو بیت ہیں" لیکن شمار کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

اس میں دراصل سات سو اکہتر (۷۷۱) ابیات ہیں۔

اس رسالہ کا انتخاب بھی اس کتاب (فیض سخن) کے آخر میں شامل ہے جس کے مطالعہ سے اس کی خصوصیات اور افادیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

فیض جاری کے سلسلہ میں حضرت فیضؔ کی ایک اور کتاب خزانۃ الامثال کا ذکر بھی ضروری ہے جو اردو کی اصطلاحوں اور لغات سے متعلق لکھی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ یہہ کتاب اس مضمون کی ترتیب کے وقت دستیاب نہ ہو سکی لغات و اصطلاحات کی کتابوں کے علاوہ حضرت فیض نے صرف و نحو پر بھی کئی کتابیں لکھی تھیں۔ جن میں سے ایک شمس التصریف اس وقت نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ کے کتب خانہ میں موجود ہے اسکا ذکر آگے کیا جائیگا دیگر کتب مثلاً شمس النحو، شرح منظومۂ صرف، رسالہ در بیان ناسخ و منسوخ، طریق الفیض شرح ماۃ عامل، شرحِ کلمۃ الحق اور مفید در احکام حلت و حرمت وغیرہ بھی اس مضمون کی ترتیب کے وقت نہ مل سکیں۔

فن عروض میں بھی انھوں نے دو کتابیں موسوم متن میر شمس الدین ۱۲۳۵ھ اور شرح میر شمس الدین لکھی تھیں جن میں پہلی کتاب خود انہی کی زندگی میں تلف ہو گئی جس کا ذکر موخر الذکر ۱۲۵۲ھ کی تمہید میں خود حضرت فیض نے اس طرح کیا ہے:۔

"قبل ازیں رسالۂ مختصر مسمیٰ بہ "متن میر شمس الدین" کہ مادۂ تاریخش ہمی بود در سالہ ۱۲۳۵ یکہزار دو صد و سی و پنج ہجری تالیف نمود۔ از التفاقات زمانہ آشنائے بنا بر نقش درخواست گروہ شیرازۂ جمعیتش را پریشان ساخت بعد چندے باظہار ایں معنی پرداخت"۔

دوسری کتاب "شرح میر شمس الدین" حسن اتفاق سے اس وقت تک نواب محمد کریم الدین خاں صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کا موضوع فن شعر خاصکر عروض، قوافی اور صنایع بدایع ہے۔ متوسط ضخنی کے (۱۱۵) صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر ۱۳ سطور ہیں۔ اسکا سبب تالیف یہہ لکھا ہے۔

"بحسب استدعا بعض احباء خصوص بپاس خاطر مولوی ولی محمد سلمہ اللہ تعالے پرداختم..... بہ سہ ضیاء و یک فیض ترتیب دادہ موسوم بہ شرح میر شمس الدین ساختم و بعونہٗ مادہ تاریخش ہمیں افتاد۔ سنہٗ مبداء و الیہ المعاد۔"

ضیائے اول میں شعر کی تعریف کی گئی ہے۔ ضیائے ثانی میں قافیہ کا ذکر کیا ہے اور ضیائے ثالث میں صنایع لفظی و معنوی کی بحث اور تمثیلات ہیں۔ اس ضمن میں تحریر فرمایا ہے

"بدانکہ معمہ و لغز اگرچہ در اقسام صنایع و بدایع است مگر مولف موجب خفقان و خلجان طبع خود می داند لہٰذا از کتاب بہ تقریرش نمی کند بنا براں کہ در صنعت معما بجز کوہ کندن و کاہ برآوردن فائدہ دیگر متصور نیست۔ علی ہٰذا القیاس صنعت لغز ہم است۔"

کتاب کے آخری عنوان "فیض" میں جدول تاریخ اور دایرۂ ابولیعی کے علاوہ چند فارسی غزلیں "بحور مستخرجۂ مولف" میں لکھی گئی ہیں اس کتاب کی تین فصلوں کا نام اپنے فرزند ضیاء الدین احمد کے نام کی مناسبت سے رکھا ہے اور آخری حصہ یعنے ضمیمہ کو مصنف نے خود اپنے تخلص کی مناسبت سے موسوم کیا ہے۔

شمس التصریف عربی زبان میں علم صرف پر لکھی گئی ہے۔ سنہ تصنیف ۱۲۵۳ھ ہے

حضرت فیض نے اپنے فرزند ضیاء الدین احمدؒ کی تعلیم کی خاطر اس کو قلمبند کیا تھا۔ اس کا نسخہ اس وقت محفوظ ہے جس کا ذکر گذر چکا ہے۔

حضرت فیض نے بتاریخ ۱۴ رجب ۱۲۸۳ھ ہفتہ کی شام میں رحلت فرمائی۔ وہ زیادہ دن بیمار نہ رہے اور آخر وقت تک علمی و ادبی مشغلہ جاری رہا۔ ان کے جملہ تلامذہ نے اس حادثہ کی تاریخیں قلمبند کی ہیں جن میں حکیم مزاج کا حسب ذیل قطعۂ تاریخ قابل ذکر ہے اس میں سنِ پیدائش اور سنِ وفات دونوں موجود ہیں۔

بود ست سنِ تولد فیض ہر گاہ وجود مظہر کل ۱۱۹۵ھ
شد سال وصال او بوحدت باللہ وجود مظہر کل ۱۲۸۳ھ

حضرت کے بعد ہر سال ان کا عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اُن کے جملہ تلامذہ اِس میں حصہ لیتے تھے۔ عرس اور مشاعرہ کا انتظام نواب مشرف جنگ فیاض کے ذمہ تھا جنھوں نے اپنی وفات (یعنے ۵۴ سال) تک اس تقریب کو شایانِ شان طریقہ پر جاری رکھا ان کے بعد انکے فرزند رشید نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز نے بھی چند سال یہہ خدمت انجام دی قریب قریب پچاس سال تک یہہ عرس اور اس کے مشاعرے حیدرآباد کی علمی و ادبی دنیا کا مرکز بنے رہے۔ اِن مشاعروں کے لئے نہ صرف دکن بلکہ شمالی ہند کے اکثر مقامات سے بھی غزلیں آتی تھیں اور شریک ”گلدستہ فیض“ ہوتی تھیں جو ہر سال خاص اہتمام سے شایع کیا جاتا تھا۔ عرس کے روز حضرت کے مزار پہ شامیانہ و فرش، پخت دیز اور چراغاں کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا تھا۔ دُو روز تک خلق اللہ کا اژدحام رہتا متعدد اصحاب صندل لے آتے تھے جن میں

صاحبزادہ وزیر علی پاشاہ آصف یادر الملک اور راجہ محبوب نواز ونت باقی کے صندل بڑے تزک واحتشام سے جلوس کے ساتھ آتے تھے جنکے ساتھ فوجیں ہاتھی، اونٹ بھی ہوتے اور خلق اللہ کا ہجوم رہتا یا شہر کے اکثر امراء اور صاحبانِ علم وفضل زیارت یا شرکت مشاعرہ کیلئے حاضر ہوتے تھے تلامذہ کے علاوہ حضرت کے مریدین اور معتقدین بھی کثرت سے شریک ہوتے اور مجلس سماع اور مولود خوانی ہوتی۔ حضرت کے خلیفہ اول قاضی غلام نبی شاہ صاحب قبلہ صدیقی القادری المعروف حضرت کمبل پوش تھے۔ عرس کے بعد کئی روز تک حضرت کے معتقدین اور تلامذہ کے مکانوں میں فاتحہ اور نیاز کی جاتی تھی۔ چنانچہ جمال الدین مطلب بھی اپنے یہاں بڑے اہتمام سے نیاز کرتے تھے اور اس میں وعظ و مولود خوانی کے علاوہ خود مطلب مثنوی بھی پڑھتے تھے۔ ان کے یہاں بھی خلق اللہ کا ہجوم رہتا۔

حضرت کے صرف تین فرزند تھے۔ ضیاء الدین احمد، عماد الدین محمد وصف اور حیات الدین محمد صاف تینوں نے لاولد انتقال کیا۔ بڑے فرزند ضیاء الدین محمد کی تاریخ پیدائش ۱۲۴۱ھ کے لگ بھگ ہوگی کیونکہ انہی کی تعلیم کیلئے حضرت نے شرح میر شمس الدین فارسی میں اور شمس التصریف عربی میں لکھی تھی انہوں نے طویل عمر پائی اور حسب تحریر نواب محمد کریم الدین خاں صاحب ۱۳۱۱ھ کے بعد تک زندہ تھے۔

عماد الدین محمد وصف کا عرف پاپا میاں تھا۔ وہ اپنے والد کی آخر عمر میں بیمار ہوگئے تھے چنانچہ انکی صحتیابی کے موقع پر حضرت نے کئی تاریخی قطعات لکھے تھے۔ جن میں ایک یہاں درج کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں مرض کا بھی ذکر ہے ؎

وہ عماد الدین محمد ہیں جو ہیں پاپا میاں !	دملوں کے رنج و ایذا سے انہیں صحت ہوئی
سال صحت فیض صاحب مجھ سے فرماتے تھے کل	میرے نور العین نے ہے پائی صحت آج ہی

۱۲۸۲

دوسرے مادہائے تاریخ یہ ہیں۔ ۱۔ عمادالدین صحت از دعا یافت۔ ۲۔ بآرام سے ہوئی تاریخ غسل پایا بیما ہوا واللہ افسوس ہے کہ انکا کلام دستیاب نہ ہوسکا۔ نواب کریم الدینخاں نے لکھا ہے کہ "بعض واقعات کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ ۱۳۱۱ھ سے قبل عمادالدین وصف کا انتقال ہوا"

حیات الدین صاف سب سے چھوٹے فرزند تھے اور سب سے اول یعنی ۱۲۹۹ھ میں وفات پائی۔ انکا دیوان چھپ چکا ہے۔ اور اُن کی خصوصیات کلام سے متعلق مرقع سخن جلد دوم میں تفصیلی مضمون شایع ہوچکا ہے۔

حضرت کے تلامذہ میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ مسلمانوں میں نواب بدرالدینخاں معظم الملک تمیز، میر احمد علی عصر، حکیم مظفرالدینخاں مزاح، نواب مشرف جنگ فیاض، اور محمد حفیظ الدین یاس بہت مشہور ہیں مرقع سخن میں ان سب کا نمونہ کلام اور تفصیلی حالات شایع ہوچکے ہیں۔

ہندو تلامذہ میں راجہ محبوب نواز ونت باقی، بہاری لال رمز، ستیل پرشاد خرم، اور بجولال تمکین نے اساتذہ کا درجہ حاصل کیا ہے۔ اول الذکر دو کے تفصیلی حالات و نمونہ کلام بھی مرقع سخن میں شایع ہوچکا ہے۔ تمکین نے حضرت کے دیوان پر اردو میں ایک تقریظ لکھی تھی جو دیوان کے ساتھ شایع نہیں ہوی مگر اسکا مسودہ اسوقت محفوظ ہے۔ اسکا کچھ اقتباس حضرت فیض کے کلام کے آخر میں شایع کیا جارہا ہے اسکے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ حیدرآباد میں ہندوں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کیسے مخلصانہ رہے ہیں۔

آخر میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ یہ مضمون لکھا نہ جاسکتا اگر حضرت فیض ہی کے ایک شاگرد رشید نواب مشرف جنگ فیاض کے دو صاحب ذوق صاحبزادے نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز اور نواب محمد کریم الدینخاں صاحب مرتب کی مدد نہ کرتے۔ یہ اصل میں حضرت فیض رح ہی کا فیضان ہے جو مرتب کی بے بضاعتی اور مواد کی قلت کے باوجود حضرت کی وفات کے ٹھیک تہتر ۷۳ سال بعد ایک گونہ تفصیلی مضمون تیار ہوسکا اور توقع ہے کہ آئندہ مکمل حیات بھی شایع ہوسکے۔

رفعت منزل۔ خیریت آباد
یکم رجب ۱۳۵۶ ہجری

سید محی الدین قادری زور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرم میں دیر میں جب کوئی روبرو آیا
مجھے یقین ہوا بس یہی کہ تو آیا

کسی کا کوئی بھی ممنوں نہیں ہے کر انصاف
ادھر سے میں نکل آیا ادھر سے تو آیا

وہ آ گئے لبِ دریا جو بہر بادہ کشی
حباب سر پہ اٹھائے ہوئے سبُو آیا

پھرتا ہوں بھٹکتا کوئی رہبر نہیں ملتا
ہے وہ نگھرا اس کا مجھے گھر نہیں ملتا

یارب مرض عشق ہے یا کوئی بلا ہے
چین اس دل بیتاب کو دم بھر نہیں ملتا

ہم کس سے کریں دعوئ خوں کیجئے انصاف
مقتول ہیں جس کے وہ ستمگر نہیں ملتا

سب آرزوئیں دلکی بخوبی نکل آئیں
تنہا وہ کبھی ہم سے گھڑی بھر نہیں ملتا

نقدِ دل و جاں نذر کروں مفت ہی لیکن
مجھکو مرے ڈھب کا کوئی دلبر نہیں ملتا

اچھا کیا جو آ رہے آنکھوں میں ہی وہ فیض
ایسا کہیں دنیا میں انہیں گھر نہیں ملتا

اے ہجومِ یاس بے پرسش مرے سینہ میں آ ۱۰ در ہے مشکل باب جنت چاک اک ک دار کا
نیش غم سے ہے بری سر رشتۂ اہل وفا کب ہو نشتر تشنہ لب خوں رگ زنار کا

کہاں تک بے نقابی کوندتی ہیں بجلیاں یکسر تمہارے روئے روشن کا نظارہ ہو نہیں سکتا
مسیحائی سے وہ خالی یہ بہ لبریز مسیحائی لبوں سے برگ گل کا استعارا ہو نہیں سکتا

کشتہ ہوں ان بتوں کی میں وضع کرخت کا ٹکڑا کفن میں رکھئے مرے سنگ سخت کا
ہرگز گلیم دوش پہ میرے نہ سمجھئے کھینچا ہے میں نے پوست دل تیرہ بخت کا
کیا پوچھتے ہو سلطنت عشق کا عروج زینہ ہے آسمان مرے پایۂ تخت کا
کچھ پوچھئے نہ حال دل ناتوان فیضؔ رکھتا ہے حکم کوہ کا سایہ درخت کا *

ظاہر مرے گریہ کا اثر ہو نہیں سکتا اک تار بھی اب جیب کا تر ہو نہیں سکتا
اس گھر سے پڑا کام ہے اللہ بچائے جس گھر میں فرشتے کا گزر ہو نہیں سکتا
اے ضعف سنبھالے ہوئے لے چل تو مجھے ہی ۲۰ آنا تو کبھی اُن کا ادھر ہو نہیں سکتا

سلسلہ میں عشق کی پیری نے داخل کر دیا | قامت خم گشتہ حلقہ بن گیا زنجیر کا

جلوہ دکھلاتی ہے وحشت گردش تقدیر کا | شعلۂ جوالہ حلقہ ہے مری زنجیر کا

کام معنی سے نہیں صورت پرستی کے سوا | خط رخسار بتاں خط ہے مری تقدیر کا

عشق میں حد ناتواں ہوں مانی و بہزاد سے | اٹھ نہیں سکتا کبھو خاکہ مری تصویر کا

فیض وصف مصحف رخسار میں یاں تک ہوں محو | ہے مرے دیوان پر دھوکا مجھے تفسیر کا

کیوں کر کروں نہ ذکر خط سبز فام کا | میں معتقد ہوں خضر علیہ السلام کا

عشاق سرو قد کو نہیں کچھ ضرور قید | طوق گلوئے فاختہ حلقہ ہے دام کا

بے گفتگوئے نرم نہو وصل اہل درد | مرہم ہے بہر زخم سبب التیام کا

پیری میں دل کو تیری کیا زلف یار نے | صبح وطن میں رنگ ہے غربت کی شام کا

جاتے ہی عقل جمع ہوئی خلق گرد و پیش | ۳۰ دیوانہ پن مرا ہے سبب اژدحام کا

ذی جوہروں سے اہل غرض بے نصیب ہیں | آب گہر سے کام نہو تشنہ کام کا

بے اعتبار خلق میں ہیں میرے زمزمے | ہوں نغمہ سنج کس چمن بے قیام کا

عہد پیری میں نہیں داغ جوانی کام کا — صبح کو بے نور ہے جلوہ چراغ شام کا
خلق کی تسخیر پر زاہد نے باندھی ہے کمر — سبحۂ صد دانہ حلقہ ہو گیا ہے دام کا
صبح پیری واقعی سرمایۂ غفلت ہے فیضؔ — ہو گئی ہے بھور وقت آیا مرے آرام کا

کیا کہیں تم سے شب غم ہم پہ کیا کیا ہو گیا — دل پگھل کر بہہ گیا پانی کلیجا ہو گیا
ذکر چشم مست سے میرا خرابا ہو گیا — میکدے تک بھی نہیں پہونچا کہ رسوا ہو گیا
ہو جب خفت ہے عالم میں تجرد پیشگی — میں سبک سار محبت ہو کے ہلکا ہو گیا
جلوۂ اہل صفا ہے تیرہ بختوں پر وبال — دن جہاں نکلا کہ مرغ شب اندھا ہو گیا
عرش اعظم پر رہے کیونکر نہ مجنوں کا دماغ — لیلتہ المعراج رنگ زلف لیلیٰ ہو گیا
خواب میں بھی ہے تصور شوخ چشموں کا ہمیں — بستر آرام اپنا مرگ چھالا ہو گیا
ان پری زادوں کے کوچے میں تماشے کی ہے بات — جو تماشہ دیکھنے آیا تماشہ ہو گیا

کفر جو تھا دین مرا ہو گیا — بت بھی نصیبوں سے خدا ہو گیا
کیسی دوا مجھکو مسیحا نے دی — درد محبت کا سوا ہو گیا
غیر سے لڑ بھڑ وہ مرے گھر چلے — بے مزگی میں بھی مزا ہو گیا

دل میں لگا رہنے بتوں کا خیال — گھر جو خدا کا تھا گیا ہو گیا

تیر ترا سینے میں لگتے ہی میں — آدمی تھا قبلہ نما ہو گیا

موت کدھر آتی ہے دیوانی ہے — فیضؔ تو پہلے ہی فنا ہو گیا

آنکھیں سفید ہو گئیں جوں کاغذ سفید — یہہ مجھکو انتظار ہے خط کے جواب کا

ہوں مست پا شکستۂ میخانۂ ازل — ۵۰ یارا نہیں زباں کو سوال و جواب کا

پوچھے نہ کوئی مجھ سے رہ دوزخ و بہشت — چھوڑا دوراہہ میں نے عذاب و ثواب کا

وہ بادہ نوش فیضؔ ہوں میں بھی کہ بعد مرگ — مٹی سے میری ظرف بنے گا شراب کا

ہوگا گمان صاعقۂ طور خلق کو! — رخ سے کبھی نہ الٹئے گوشہ نقاب کا

مسجد سے چند گام گیا میکدے کی سمت — آیا جو یاد شیب میں عالم شباب کا

وقت مطالعہ نظر آتا ہے روئے یار — آئینہ ہے ہر ایک ورق اس کتاب کا

غفلت میں ہو رہی ہے مری زندگی تمام — ہے رات دن خیال کسی مست خواب کا

جب وصف شوخ میرے دہن سے نکل گیا — جامے سے زندہ مردہ کفن سے نکل گیا

تقسیم جزو لایتجزیٰ کی ہوگئی سہواً سخن جو اُن کے دہن سے نکل گیا
دیکھی لٹک جو قامت موزون یار کی آزاد ہوکے سرو چمن سے نکل گیا

کیا دوس ہے کسی پہ نصیبوں سے ہے گلہ ٦٠ وہ کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا
ہتے پہ وہ جو چڑھ کے قضارا اکھڑ گیا نقشہ ہمارے کام کا بن کر بگڑ گیا
کیوں الہے گہلے اب نہیں پھرتے ہو باغ میں سرو سہی تو شرم سے مٹی میں گڑ گیا
ہر بات میں ضد اس سے مناسب نہیں ہے فیض کیا تم سے بن پڑیگی اگر وہ بگڑ گیا

خط سبزہ دہن غنچہ ہے قد سرو ہے رخ گل عالم ہے سراپا میں ترے چار چمن کا
ڈر ہے مجھے ہر سطر کہیں سانپ نہ بن جائے مضمون ہے دیوان میں زلفوں کی شکن کا

نظارے میں ہوں میں کمر یار کے بیخود ہستی میں تماشا نظر آتا ہے عدم کا
تابع دل مجروح کے ہیں جن دپری بھی ہے لخت دل اپنا بھی نگیں خاتم جم کا
حسرتک بھی نظر آتا نہیں اُن کا تھمنا دو نوں آنکھیں ہیں مری ہجر میں گنگا جمنا
شیخ کو صید کیا یا کہ برہمن کو شکار! دیر سے لیکے حرم تک ہے تمہارا اپنا

یار کے قد سے قد حور کو تشبیہ نہ دو
یادائے فیض مجھے ہے وَلَقَد کَرَّمنا

خالی حکمت سے نہیں کوئی سخن ہی اُنکا
یعنی نقطۂ موہوم دہن ہے اُن کا

ناتوانوں کا ترے ایک ٹھکانہ ہی نہیں
جس جگہ بیٹھ گئے تھک کے وطن ہی اُن کا

قد فقط سرو نہیں گال فقط گل ہی نہیں
باغ امکاں میں سراپا ہی چمن ہی اُن کا

ناتوانی کا بیاں ہم خاکساروں سے نہ پوچھ
نقش پا کی طرح اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا

تھا اثر کس نقطۂ موہوم کا یارب محیط
قامت خم گشتہ پیری میں خط پرکار تھا

قطرۂ خوں تھا کہاں سے ناخن موج نسیم
غنچہ ساں یک عقدۂ مشکل ہتنفار تھا

کسی سے پوچھتے ہرگز نہ رفتگاں کا سراغ
رہ فنا میں قدم کا اگر نشاں ہوتا

وجود میں کمر یار اگر نظر آتی
سوے عدم نہ رواں کوئی کارواں ہوتا

جو کامیاب کسی حور وش سے ہوتا وہ
لقب رقیب کا اپنے فرشتہ خاں ہوتا

رخ اپنا تم نے دکھلایا تو ہوتا ۸۰ مہ کامل کو شرمایا تو ہوتا

دہن ہے یا نہیں کیا بات ہی یہ ہے — کبھی کچھ تم نے فرمایا تو ہوتا
تماشا نٹ کا پھر تم کو نہ بھاتا — ہمیں زلفوں میں لٹکایا تو ہوتا

وصل کا دن نہ اگر یار میسّر ہوتا! — ہجر کی رات میں چلنا ہمیں دوبھر ہوتا
کوئی اس پر کبھی انگلی نہ اٹھاتا ہرگز — ماہ نو گر ترے ناخن کے برابر ہوتا
مثل پتلی کے نہ جانے تجھے دیتا باہر — میری آنکھوں میں اگر یار ترا گھر ہوتا
جائے پہلو میں جو اس گل کے نہ ملتی تجھ کو — تن مرا سوکھ کے کانٹے کے برابر ہوتا
بحر میں دست حنائی کو نہ دھویا تم نے — بدلے مچھلی کے سمندر میں سمندر ہوتا

رشک فردوس چمن ہے اپنا — حیدرآباد وطن ہے اپنا
نسبت گور و کفن بیجا ہے — گور اپنی نہ کفن ہے اپنا
زیست کو مرگ سمجھتے ہیں ہم — ۹۰ پیرہن ہے سو کفن ہے اپنا
جو وہ کہتا ہے وہ ہم کہتے ہیں — دہن یار دہن ہے اپنا
کیوں نہ طوف در محبوب کریں — کعبہ اے قبلۂ من ہے اپنا

ہوتا گر ادب مانع بہت کچھ سناتا میں — وہ اپنے گھر میں خوش رہنا خفا ہوتا تو کیا ہوتا

جو آجاتا عیادت کے بہانے سے شب فرقت — تری تعظیم کو بھر درد پہلو میں اٹھا ہوتا

پیش نظر ہے نزع میں نقشہ نگار کا — جلوہ خزاں دکھاتی ہے مجھ کو بہار کا

سرمے سے رتبہ کم نہیں اپنے غبار کا — ہے سنگ طور سنگ ہماری مزار کا

ہے بعد مرگ شوق ہمیں دید یار کا — چلمن کا حال ہے کفن تار تار کا

طرح اقامت اپنی ہو باغ جہاں میں کیا — آواز الرحیل ہے نالہ ہزار کا

ہے اپنے سوز دل کا دماغ آسمان پہ — پرتو ہے آفتاب دل داغدار کا

اے جان پاک کر نہ تن و توش پر غرور ۱۰۰ — ہے حال جسم پیرہن مستعار کا

تیار خاک گور سے ہوتے ہیں جام مے — بعد فنا بھی رنج ہے مجھ کو خمار کا

منت اعجاز مسیحا کی کریں کس واسطے — موت کر لے گی علاج اپنے دل بیمار کا

ایک ساعت ہجر کی کم اک مہینے سے نہیں — حال بتلا مثل ماہ تو ہے جسم زار کا

ہے خدا شاہد نکلنے کو نہیں ہوتا ہے جی — روضۂ رضواں ہوا کوچہ مجھے دلدار کا

تم ہی کچھ کہدو کہ تا ہو وے دلیل اس بات پہ — منہ کہاں ہے جو لکھوں وصف اوس دلدار کا

اُن کے دہن کا وصف نہ مجھ سے بیاں ہوا
پیدا وہ ہے وہاں ہو کہیں بے زباں ہوا

تھا میں غبار خاطر یاران ہم سفر
جنگل میں چھوڑ مجھکو رواں کارواں ہوا

برسوں ہی دیر و کعبے میں کہنے کو ہم رہے
بت مہرباں ہوے نہ خدا مہرباں ہوا

اے فیض مجھکو ہجر نے انساں بنا دیا
آب سر شک جائے آب رواں ہوا

آئینے کو روبرو آنے نہ دو مانو کہا ۱۱۰
آشنا صورت ہے معنی آشنا ہو جائیگا

تو ہے وہ سحر مجسم باغ میں آئے اگر
سبزۂ بیگانہ تک بھی آشنا ہو جائیگا

کیا ہوا اگر مانو ان بتوں میں بسان نقش پا
بیٹھ جاؤں گا جہاں میرا وطن ہو جائیگا

تو وہ کافر ہے اگر آ جائے مسجد میں کبھی
دیکھ کر تجھکو مسلماں برہمن ہو جائیگا

پست ہمت رہتے ہیں پامال موج حادثات
ہو جہاں پستی گذر ہوتا ہے واں سیلاب کا

تیرہ بختی میں کرے کسب ضیاء جز ضعیف
رات کو ہوتا ہے جلوہ کرمک شب تاب کا

بے کدورت زندگی کرتے ہیں ارباب فروغ
ہو نہ میلا رنگ ہرگز چادر مہتاب کا

زندگی سرگشتگی کے ساتھ ہوتی ہے بسر
ساحل بحر فنا پر جو ہوں گرداب کا

عہد پیری میں خدا کی بندگی کرتا ہوں فیضؔ
قامت خم گشتہ نقشہ بن گیا محراب کا

ماجرا لکھنا پڑا مجھ کو دل بیتاب کا
ہے اثر پیدا قلم میں ماہئی بے آب کا

سیر کرتا ہوں بہشت کوچۂ محبوب کی ۱۲۰
کم نہیں ہے موت کے عالم سے عالم خواب کا

عالم تصویر ہوں میں انتظار یار میں
میری آنکھوں نے کبھو عالم نہ دیکھا خواب کا

جینے سے انتظار نے بیزار کر دیا
آنکھوں نے میری پھر مجھے بیمار کر دیا

دیر و حرم میں سجدہ کریں شیخ و برہمن
سر ہم نے وقف سنگ در یار کر دیا

سر دوش ناتواں پہ مری اک پہاڑ تھا
تیغ نگہ نے اس کی سبکسار کر دیا

ہم نے اپنے دل کو پیش روے جاناں کر دیا
آئینہ کو آئینہ دکھلا کے حیراں کر دیا

اپنی پرچھائیں سے کوسوں بھاگتا ہوں اندنوں
مجھ کو وحشت نے زمانہ سے گریزاں کر دیا

یک جہاں مارا گیا عشق لب جاں بخش میں
تم نے عالم کو غریق آب حیواں کر دیا

ہم نے چند اوراق وصف گل میں لکھے تھے کہیں
نام انکا شیخ سعدیؒ نے گلستاں کر دیا

نہیں درکار ہے تعویذ فرازِ مرقد　　دل پہ کندہ ہے مرے نقش تری بازو کا

رات محفل میں وہ بے پردہ جو آبیٹھ گئے　　۱۳۰ بہر تعظیم اٹھا درد مرے پہلو کا

گالی ان کی کبھی کھائی کبھی غصہ کھایا　　جب سے عاشق ہوں کسی دن نہ رہا میں بھوکا

ساتھ لاشے کے چلی حافظِ شیراز کی روح　　فیضؔ مقتول ہوں میں شاہد مصحف رو کا

لعل ہیں جان بخش اس محبوب کے　　آگ سے آبِ بقا پیدا ہوا

بیٹھ کر اٹھا نہ کوئے یار سے　　میں مثالِ نقشِ پا پیدا ہوا

سیکڑوں آئینہ رو جب مر مٹے　　ایک یہ حیرت زدا پیدا ہوا

فیضؔ کعبے چل کلیسا میں ہے کیا　　بت ہوئے پنہاں خدا پیدا ہوا

بند مرہم سے نہ کر روزن مرے ناسور کا　　اس جھروکے سے نظر آتا ہے عالم دور کا

ذکر ہوتا ہے کسی کے عارضِ پر نور کا　　کرمکِ شب تاب ہے عالم چراغِ طور کا

رکھ دیا بارِ امانت عشق نے سر پر مرے　　اشرف المخلوق کو رتبہ ملا مزدور کا

کیا کہیں تم سے کیا نہیں ملتا　　۱۴۰ جان کا آشنا نہیں ملتا

شیخ کعبہ چلوں جو تیرے ساتھ | دیر میں کیا خدا نہیں ملتا
ایسی کثرت ہے اس کے کوچے میں | کہ مجھے راستہ نہیں ملتا
کیا خدا کی کروں تلاش اے فیضؔ | مجھکو میرا پتا نہیں ملتا

یاد میں اُس معنی توحید کی | بھول جا رستہ امید و بیم کا
ہے رضا معبود کی منظور اگر | چھوڑ مت دامن کبھی تسلیم کا

میں شہید ناز ہوں مسکن مرا مدفن ہوا | عاقبت میرا کفن میرا ہی پیراہن ہوا
مرتبہ یاں پست کا بالا پس مردن ہوا | سنگ پا آخر مرا سنگ سر مدفن ہوا
ہے اسیری آرزوئے خلقت دیوانگی | طوق گردن مجھکو میرا حلقۂ دامن ہوا
افعی کاکل نظر آتے ہیں لہراتے ہوئے | کیا دل ویراں ہمارا کیوڑے کا بن ہوا
ہے دلیل رہنمائی تیرہ بختی بعد مرگ ۱۵۰ | مشعل راہِ فنا داغ دل روشن ہوا

جام خورشید ہے ایاغ اپنا | چرخ چارم پہ ہے دماغ اپنا
دل پر داغ ہے ہمیشہ بہار | باغ جنت ہوا ہے باغ اپنا

چھان ڈالی جہان کی مٹی　　نہ ملا آج تک سراغ اپنا
دو جہاں کی ہے جسمیں گنجائش　　دل ہے وہ گوشہ فراغ اپنا
یار نے فیضؔ جب سے دی کرسی　　عرش اعظم پہ ہے دماغ اپنا

مشتاق ہو نہ اِس چمن کائنات کا　　کیا اعتبار جلوہ گہِ بے ثبات کا
بعد فنا ہے اس لبِ جاں بخش کا خیال　　جاری ہے میری خاک سے چشمہ حیات کا
پامال کر دیا مجھے ترسا بچوں نے فیضؔ　　ہوں خاکسار میں بھی در سومنات کا

جب مر مٹا تو اہل نظر تک رسا ہوا　　بعد فنا غبار میرا طوطیا ہوا
رونے سے آبرو کو ترقی ہوئی نصیب　　۱۶۰　ہر ایک اشک رشکِ درِ بے بہا ہوا
ہوں بادشاہ وقت مگر ہوں فقیر دوست　　نقشِ صریر مجھ کو خط بوریا ہوا
آیا عدم سے میں جو سوئے گلشن وجود　　شوق نظارۂ چمن ما سوا ہوا
ہم خلقت حباب ہیں اے فیضؔ کیا کہوں　　لی میں نے سانس اِدھر کہ اُدھر دم ہوا ہوا

انقلابِ دہر کا جب رنگ دیگر ہو گیا　　پتھر آئینہ ہوا آئینہ پتھر ہو گیا

فیض کیننگ مدحت زلف ولب لعل بتاں	مشک مٹی ہو گیا یاقوت پتھر ہو گیا

کون سی بات کا دہوکا نہ دیا	تم نے کب مجھ کو بتولا نہ دیا!
سیدھے کب مجھ سے رہے وقت سوال	کب جواب آپ نے الٹا نہ دیا!

پڑگئے دل میں ہزاروں سوراخ	تم نے پر بند جھروکا نہ کیا
ہم اِسی رشک سے درپردہ ہوے	تم نے اغیار سے پردا نہ کیا
مری بدنامی ہے منظور اسے	نامہ لکھا تو لفافہ نہ کیا
پیٹ پکڑے ہوئے پھرتا ہوں مگر	راز فاش اُن کی کمر کا نہ کیا

قدم قدم پہ ہے انداز دلربائی کا	ستارہ اوج پہ ہے انکی زیر پائی کا
نہیں ہے پاس مسیحا کے بھی دوا اسکی	کسی کو روگ خدایا نہو جدائی کا
وہ کوہکن ہوں اجل مجھکو خواب شیریں ہے	گماں جنازہ پہ ہوتا ہے چارپائی کا
خدا سے عرض کروں گا جو سامنا ہوگا	بتوں کی ذات میں جوہر ہے بے وفائی کا
ہمیں کل آئی نہیں آج تک کسی پہلو	بندھا ہے جب سے تصور تری کلائی کا

جناب فیضؔ یہہ بدمستیاں بتوں کے ساتھ　ڈرو خدا سے یہہ موسم ہے پارسائی کا

پیری میں داغ عشق مٹایا تو کیا ہوا　میں نے چراغ صبح بجھایا تو کیا ہوا

مدت سے شبہ گل کا مجھے تھا ہوا وہ دور　گالوں کو میں نے ہاتھ لگایا تو کیا ہوا

ہے لوٹنے کی جائے نہیں رنج کا محل　۱۸۰　تو نے مجھے لہو میں لٹایا تو کیا ہوا

بن کے جاتا ہے بگڑ کام مرا　ہے وہ آغاز یہہ انجام مرا

یا الٰہی نہ گرفتار ہو کوئی بندا　حلقۂ زلف مسلسل ہے اجل کا پھندا

بخدا دم سے ہمارے ہے یہہ گہما گہمی　ورنہ برسوں ہی سے بازار وفا تھا مندا

کیا سروکار ہے تعویذ لحد سے مجھ کو　نقشِ پا یار کا ہو میری لحد پر کندا

کون کس کا ہے فقط وہم ہے تیرا میرا　ہے یہہ سب ہستیٔ موہوم کا جھوٹا دھندا

پیچ سے زلف کی دوبھر ہے مرا چھٹکارا　جان کے ساتھ ہے اے فیضؔ یہہ گورکھ دھندا

مدعا دل کا بر آیا ہوتا | رام وہ بت جو خدایا ہوتا
نہ لیا آپ نے دل لینا تھا | وہ کبھی کام پر آیا ہوتا
دیکھتے ہم بھی خدا کی قدرت | تم نے گھونگٹ تو اٹھایا ہوتا

دکھاتے تم تو ہو گردن کا ڈورا ۱۹۰ نہ ڈھل جائے کہیں منکا کسی کا
نہیں گھٹا ہے زاہد کی جبیں پر | دیا ہے سر میں بدنامی کا ٹیکا
اگر وہ کعبہ رُو ساقی بنے فیضؔ | گماں کنٹر پہ ہوگا زمزمی کا

لکھیں جو چاہیں کاتبِ اعمال | دن تو آنے دو روبکاری کا
سرخرو کر دیا ہے عالم میں | میں ہوں ممنون بادہ خواری کا
ہے موئے پر بھی فیضؔ شوقِ عروج | نقشہ گنبد میں ہے عماری کا

جلد ہلکا ہو کہیں بوجھ مری گردن کا | اوچھی دیکھ کے سفاک کو ماتھا ٹھنکا
صبح سے شام تلک مجھکو جھلاتے کیوں ہو | موسم آیا نہیں سرکا ابھی ساون کا
پسِ مردن نہ کیا یاد مجھے جب اُس نے | راستہ بھول گئے لوگ مرے مدفن کا

کیا نکیرین سے تقریر کروں لحد میں فیضؔ چپ ٹھکانے نہیں کشتہ ہوں کسی چتون کا

ہم نے جب آپ کا جلوہ دیکھا ۲۰۰ سب کچھ اے قبلہ و کعبہ دیکھا

مجھکو دھوکا دل مضطر کا ہوا جب کبوتر کوئی اڑتا دیکھا

آنکھ جب کھل گئی مانند حباب ق ہم نے کچھ اور ہی نقشا دیکھا

بخدا آپ کو اے مایۂ ناز طرفۃ العین میں دریا دیکھا

عمر رفتہ نے کیا منہ نہ اِدھر مدتوں فیضؔ نے رستا دیکھا

نہیں کون عالم میں شیدا تمہارا نہیں کون سے سر میں سودا تمہارا

مرے دردِ سر کا مرے درد دل کا ہے تعویذ نقشِ کفِ پا تمہارا

قدر نے کیا کب قضا نے کیا ادا مجھکو اُن کی ادا نے کیا

ترے دستِ رنگیں ہیں دونوں گواہ مرا خون دزدِ حنا نے کیا

گئی جانِ عشق لبِ یار میں اثر سم کا آبِ بقا نے کیا

حرم میں کلیسا میں رسوا مجھے ۲۱۰ بتوں نے کیا کب خدا نے کیا

کھنچا دل حسینوں کی جانب مرا — اثر کاہ پر کہربا نے کیا

نہیں سوجھتا کچھ مجھے روزِ غم — یہہ اندھیر زلفِ دوتا نے کیا

کیا فیضؔ نے بندہ پرور وہ کام — اِبا جس سے ارض و سما نے کیا

اوج پر بادہ کشو نیرِ اقبال آیا — لو مبارک ہو تمہیں غرۂ شوال آیا

میں نے بیساختہ جانا خط جاناں ہوگا — سامنے حشر میں جب نامۂ اعمال آیا

جلوہ گر جب وہ نونہال ہوا — ہر شجر باغ میں نہال ہوا

اِس گلستاں میں وہ ہوا سرسبز — مثل سبزہ جو پائمال ہوا

جمع بیمار چشم ہیں صدہا — کوچۂ یار اسپتال ہوا

دیر سے بھی گئے نکالے ہم — قہر بت قہرِ ذوالجلال ہوا

معنی وحدت الوجود یہہ ہے ۲۲۰ ایک ہی اپنا حال و قال ہوا

تھا جو درباں قدیم فیضؔ انکا — بر طرف ہو کے پھر بحال ہوا

ذکر جس نے زلف کی لٹ کا کیا — عمر بھر زنجیر میں لٹکا کیا

رفتگاں کا کھوج پایا ہی نہیں — گرد کی مانند میں بھٹکا کیا

عاشقوں کی خاک پٹتی ہی رہی — یار دامن کو عبث جھٹکا کیا

کیا ہوا حاصل تجھے شیخ حرم — سالہا کعبے میں سر پٹکا کیا

جب ہوا نوکِ مژہ کا ذکر فیضؔ — نیشتر شریان میں کھٹکا کیا

لحد میں بھی ہے خیال تجلئ رخِ یار — چراغِ گور ہمارا چراغِ طور ہوا

فلک سے جھانکتے رہتے ہیں مہر و مہ دن رات — تمہارا تذکرۂ حسن دُور دُور ہوا

وہ رشکِ حور بہشتی ہوا جو ساقی بزم — قدح شراب کا جام مئے طہور ہوا

باعتبار محل دو ہیں فی الحقیقت ایک — ۲۳۰ کہیں بطون ہوا اور کہیں ظہور ہوا

یہہ معجزہ ہے تری چشم مست کا بے مے — نشے میں محتسب شہر چور چور ہوا

دوئی جو دور ہوئی دل سے ایک لمحے میں — جسے سمجھتے تھے ہم غیب وہ حضور ہوا

خطا خطا کو سمجھتے نہیں کبھی اے فیضؔ — وظیفہ جب سے ہمارا ہو الغفور ہوا

میں عاشق ہوں رخ و گیسو و ابروے مقدس کا — سحر سے شام تک نظارہ ہے بیت المقدس کا

شرف فرہاد پر خسرو نے اے شیریں کہاں پایا — دیارِ عشق میں منصب ہے یکساں ناکس و کس کا

پتہ ملا نہیں جب تک تمہاری چوکھٹ کا	رہا دو راہے میں دیر و حرم کے میں بھٹکا

نہاں عیاں میں بھی ہم آپ ہی کو دیکھتے ہیں	نہیں لحاظ رہا گھٹ کا اور پرگھٹ کا

چلا چل آنکھوں کو موندا ہوا وجود سے تو	رہ عدم میں کہیں کھیل کا نہیں کھٹکا

ازل کے سوئے ہوئے چونک پڑتے ہیں	یہہ معجزہ ہے تمہارے قدم کی آہٹ کا

شب قلق نے کہیں بیٹھنے دیا نہ مجھے ۲۴۰	اٹھا اٹھا کے دل بے قرار نے ٹپکا

فقط یہہ آرزو بھگت دم کے ساتھ تھی اے فیض	پس فنا نہ کوئی میری خاک پر بھٹکا

عید کے روز جدائی میں شب غم ہو گا	ماہ شوال مجھے ماہ محرم ہو گا

جمع درہم کیلئے ہو نہ پریشاں اتنا	ایک دن گنج ترا درہم و برہم ہو گا

مر گئے پر بھی رہے گا اثر شورش غم	گور میں بھی مرے ہمراہ جہنم ہو گا

کشتۂ عصمت جاناں ہوں قسم عیسیٰ کی	بہر تکفین مری دامن مریم ہو گا

وصف الآن کما کان مرا حال ہے فیض	نہ زیادہ کبھی ہو گا نہ کبھی کم ہو گا

ساجد ہوں آستانۂ اہل نیاز کا	پابند صوم ہوں نہ مقید نماز کا

ہر شخص سے مناظرہ بالعکس ہے مرا	صورت شناس ہوں کسی آئینہ ساز کا

میں ہوں آزاد کروں کیا سر و ساماں پیدا　　اُس نے قدرت سے کیا ہے مجھے عریاں پیدا
مر گئے پر بھی تعشق ہے خط و گیسو سے　۲۵۰　مری مٹی سے ہوئے سنبل و ریحاں پیدا
دیر و کعبے کے دو راہے میں ہیں دن رات خراب　　کیسی ساعت میں ہوئے گبر و مسلماں پیدا

شمع ساں بزم جہاں میں تاجِ زر پیدا کیا　　سر فروشی نے مری حسنِ دگر پیدا کیا
غم نے زلفوں کی حرارت کا اثر پیدا کیا　　دھوپ میں پھر پھر کے ہم نے دردِ سر پیدا کیا
خط روئے یار مورِ خرمنِ امکاں ہوا　　برق کا رخسارِ تاباں نے اثر پیدا کیا
ہے فراقِ یار مجھ کو حاصلِ صد بحر و کاں　　لختِ دل نے لعل آنسو نے گہر پیدا کیا
ہاتھ میں پتھر لئے آتے ہیں جو آتے ہیں پاس　　نخلِ وحشت نے ہمارے یہ ثمر پیدا کیا

کل سے ناساز ہے مزاج اپنا　　آج ہو جائے گا علاج اپنا
کل کسی اور کے ہے قبضہ میں　　جس کو تو جانتا ہے آج اپنا
دیر ہی میں پڑے رہیں اے فیضؔ　　کیا ہے کعبہ میں کام کاج اپنا

ہوتا ہے مری جان پہ جو جو ستم اے جان　۲۶۰　دشمن کے بھی دشمن سے یہ دیکھا نہیں جاتا
ہوتا ہے کہاں طائرِ دل صید کسی کا　　دو در آپ کی بندوق کا چھرا نہیں جاتا

پٹکوں تجھے لیجا کے کدہر اے دلِ مضطر نچلا تو کسی بزم میں بیٹھا نہیں جاتا
سب آرزوئیں ساتھ گئیں دل کی مگر فیضؔ بوسہ کا جو لپکا ہے وہ لپکا نہیں جاتا

رخ پر آغاز اُن کے سبزا ہو گیا مصحفِ ناطق محشّٰا ہو گیا
کل کا وعدہ آج پھر اُس کے کیا لطف ہی امروز فردا ہو گیا
ہجر میں پڑھتا ہوں سورہ قاف کا وصل جاناں فیضؔ عنقا ہو گیا

ہر قدم پر فتنہ ہوتا ہے کھڑا بھونچال کا ہے چلن ٹکسال باہر ان بتوں کی چال کا
حال رندانِ سبو کش کا جو میخانہ میں ہے شکر میں یہہ رنگ کب ہے صوفیوں کے حال کا
کیوں نہ ٹکڑا توڑ کر قاصد کو بدلے خط کے دے حال ہے معلوم اسکو اس شکستہ حال کا

نہیں کون عالم میں شیدا تمہارا ۲۷۰ نہیں کو نسے سر میں سودا تمہارا
مرے دردِ سر کا، مرے دردِ دل کا ہے تعویذ نقشِ کفِ پا تمہارا

موسم پیری میں قدِ دلربا یاد آگیا ٹھوکریں کھانے لگے ہم جب عصا یاد آگیا

مدتوں بھولا رہا میں اس وجود آباد میں
جب کمر دیکھی عدم کا راستہ یاد آگیا

موت کی تلخی حلاوت سے مبدل ہو گئی
جاں کنی میں دلبرِ شیریں ادا یاد آگیا

بے جہت کوئی کسی کا منتظر رہتا ہی فیضؔ
راستہ بھولا تو مجھکو رہنما یاد آگیا

دشت میں آوارہ ہمکو شہر میں رسوا کیا
کیا کہیں تم سے سلوک اس عشق نے کیا کیا کیا

پوچھتے کیا ہیں دمِ تکبیر تو نے کیا کیا
صورتِ آئینہ چہرہ آپ کا دیکھا کیا

جب تلک اک جاں دو قالب کا تصور جنباں تھا
سم بھی گر تم نے دیا تریاق میں سمجھا کیا

حافظوں میں کیوں نہ ہو محشور مجنوں روزِ حشر
یاد سبحان الذی بھی اسنے نا لیلا کیا

سمجھے مضموں نہ اللہ ہو کا ٢٨٠ جھگڑا جب تک نہ مٹا میں تو کا

حال کہتا ہے رخ ہندو کا
دخل کعبہ میں ہوا ہندو کا

کیا بتائے گا ہمیں عشق کی راہ
خضر ہے آپ ہی بھولا چوکا

جب گیا باغ میں وہ غنچہ دہن
منہ پہ شبنم نے گلوں کے تھوکا

عمر غفلت میں گنوائی ہم نے
یہہ مثل سچ ہے کہ سویا چوکا

زیب گوش یار بالا ہو گیا　حسن چہرہ پر دو بالا ہو گیا

جب سے میں مداح قد یار ہوں　شاعروں کا بول بالا ہو گیا

صبح دم آیا جو وہ خورشید رو　منہ شبِ فرقت کا کالا ہو گیا

آب دیدہ جام مے ہیں ساقیا　کیا کسی مےکش کا پیالا ہو گیا

اے فلک تف ہے رقیب اس یار سے　ہم نوالہ ہم پیالا ہو گیا

فیضؔ وہ مہوش جو آیا سمجھے ہم　۲۹۰ مہرباں باری تعالیٰ ہو گیا

کیا کہیں کیا حال تن کا ہو گیا　سوکھ کر فرقت میں تنکا ہو گیا

بے جہت بندہ بتوں کا ہو گیا　پھر خدا جانے مجھے کیا ہو گیا

دل نے جو اودھم مچائی ہجر میں　حشر کا ہنگامہ برپا ہو گیا

بات کا انکی نہیں ہے اعتبار　وعدۂ امروز فردا ہو گیا

معصیت سے باز آتے ہی نہیں　فیضؔ صاحب آپ کو کیا ہو گیا

چراغ دیر میں جو نور قندیل حرم کا تھا　اسی آتش کے پرکالے کا ہر اک جا ئے چمکا تھا

کسی کی لو میں اک دل سوختہ یاں شام سے اب تک　چراغ صبح کی مانند جہاں کو کوئی دم کا تھا

جو کام ہے خوشی کا دنیا میں کم نہوگا — جانے سے کچھ ہمارے یاروں کو غم نہوگا
کیوں اے قضا ہمیں تو تکلیف دے رہی ہے — آباد ایک دم سے ملکِ عدم نہوگا

دیکھتے برقِ تجلی کی شرارت ہم بھی ۳۰۰ کیا کریں داغِ جگر ایک بھی روشن نہ ہوا
ربط ہمکو بھی سر رشتہ سے وفا کے ہوتا! — دل میں جوں دیدۂ سوزن کوئی روزن نہوا

سوادِ خطہ بیاضِ رخ کو ترسا — بسانِ کلک تھا جو جبہہ فرسا
سراپا جل گئی کشتِ دل اے چشم — یہہ اب کے سال کیسا مینہ برسا
کسی خورشید رو کی لو میں اے فیضؔ — مرا تن گل گیا شمعِ سحر سا

خوابِ عدم سے یار اٹھائے تو ہم اٹھیں — بالیں پہ اپنی عیسئی مریم ہوا تو کیا
ہیں بے نصیب شربتِ دیدارِ یار سے — ساغر میں زندگی کے اگر سم ہوا تو کیا
کیجے نگاہ آمدِ لختِ جگر پر آج! — جوشِ سرشکِ فیضؔ اگر کم ہوا تو کیا

مزاج اپنا کبھی برہم نہوتا — جو تم ہوتے تو اتنا غم نہ ہوتا

نہ آتا پیچ میں، یارب جو مجھکو خیالِ زلف خم درخم نہ ہوتا
ہماری کشتِ دل ہوتی نہ سرسبز ۲۱۰ اگر یہ دیدۂ پُرنم نہ ہوتا

وہ رشکِ مسیحا سرِ بالیں جو نہیں تھا
ہر ہر نفس اپنا نفسِ بازپسیں تھا
دنیا تھی کدہر اور کدہر ساکنِ دنیا
تھا وہم ہمارا نہ مکاں تھا نہ مکیں تھا
مدت تلک اپنے دلِ مضطر سے پسِ دفن
اک زلزلۂ حشر بپا زیرِ زمیں تھا
تھا فیضؔ اُسی رندِ شرابی کا تخلص
ہمسایہ میں اپنے جو خراباتِ نشیں تھا

جب سے نظر میں ہے خمِ ابروئے مہِ‌وشاں
شمشیر ماہِ نو سے مرا دل اوتر گیا
اے ہم نفس خموش اسی بات پر تو رات
سر شمعِ زار کا سرِ محفل اوتر گیا
کہدو کہ فکرِ آبِ بقا کی کرے نہ خضر
اس چشمۂ حیات سے گھاٹ اوتر گیا

جو آگئی کہیں یاد اس گلِ نزاکت کی
برنگِ بلبلِ تصویر میں خموش رہا
جلے ہزار دل ہی عاشق برنگِ پروانہ
مثالِ شمع جہاں فیضؔ سرفروش رہا

نقشِ پا کو ترے جہاں دیکھا ۰ ۳۲ اپنی آنکھوں سے ہیں جدا نہ کیا
زندگی بھر رہا مکدر وہ !! دل کا آئینہ جو صفا نہ کیا

پری سمجھا کبھی میں حور سمجھا تجھے کیا کیا نہ اے مغرور سمجھا
بھٹکتے ہی رہیں نزدیک جو فیض بتوں نے کیا خدا کو دور سمجھا

کل سے جی پھر نڈھال ہے اپنا آج بچنا محال ہے اپنا
جب سے وہ خواب میں نہیں آئے اور ہی کچھ خیال ہے اپنا

گرد رہتے ہیں سدا طفلانِ شہر اپنا جینا بھی تماشا ہو گیا

برنگ نقشِ قدم میں بھی تھک کے بیٹھ رہا کہیں نہ یارِ عدم رفتہ کا سراغ لگا

تھا بیابانِ خطر جسکو چمن جانا تھا تھا سفر ہم نے یہاں جسکو وطن جانا تھا
سیر گلزارِ محبت کی ہوس تھی جب تک تنگدل میں تجھے اے غنچہ دہن جانا تھا

بولے وہ مجھ سے میں جو لیا نام تیغ کا ۳۳۰ خوش ابروؤں کی بزم میں کیا کام تیغ کا
ہم سر فروش جب سے ہیں کوچے میں یار کے بازار گرم ہے سحر و شام تیغ کا

دامن جھٹک کے چھوڑ گئے مجھکو ہمرہاں جوں گرد قافلے کے جو میں منفصل گیا

تا چند احتیاط کرد دل غم سے قبض میں آخر دل و جگر کو یہہ مہمان کھائیگا

اٹھائے دن میں سو سو رنج ہم نے بھلا ہو دے دل پر آرزو کا
نہ کرنا خوابِ غفلت او مسافر مثل مشہور ہے سویا سو چوکا

جہاں آنسو گرائیں اس زمیں کو زمین سیر حاصل دیکھتا تھا
غبار اپنا نہ تھا صحرا میں کوئی سراغ اہلِ منزل دیکھتا تھا

کسی بدمست کے ہاتھوں سے پیمانے پہ کیا گذرا خدا جانے تری آنکھوں سے میخانے پہ کیا گذرا
کیا غمزوں نے اوس کے قتل اپنے ہر یگانے کو بیاں تم سے کروں کیا مجھ سے بیگانے پہ کیا گذرا

۳۴۰

پھرتی ہے آج لیکر یاں سرنوشت ہر سو — کل اس زمیں پہ اپنا نقش قدم نہ ہوگا

مردم چشم کو جب قبلہ نما سمجھا تھا — ابروئے یار کو محراب دعا سمجھا تھا

اور کچھ رمز تھا وہ اور ہی کچھ بات تھی فیض — یار لوگوں نے یہاں جس کو خدا سمجھا تھا

سبو بنا نہ صراحی بنا نہ ساغرِ مے — حصول کچھ مری مشتِ غبار سے نہ ہوا

بتوں نے تیغ تو کھینچی تھی ہجر میں لیکن — مقابلہ دل امیدوار سے نہ ہوا

کون یاں خاطر میں لاتا ہے مجھے — تو ہی جب پیارے کشیدہ ہو گیا

کچھ پوچھئے نہ دردِ سرِ عشق کا بیاں — اب تک فرازِ گور ہے صندل لگا ہوا

دریا اگر مژہ سے بہے کچھ عجب نہیں — ساتھ اپنے چشمِ تر کے ہی بادل لگا ہوا

آوارہ آج دشت میں ہے گرد کی طرح — دامانِ کارواں سے جو تھا کل لگا ہوا

زبانِ آئینہ رو کو جو ہم سے کینہ رہا ۳۵۔ بجائے سنگِ مزار اپنے آبگینہ رہا
بغیر نیشِ الم ناسور کو حاصل کیا فگار سودۂ الماس سے نگینہ رہا
جو دورِ ساغرِ مے بزم میں ہوا جاری نہ واں لحاظ رہا اور نہ یاں قرینہ رہا
نہ مجھ سے پوچھئے کچھ چرخ سفلہ پرور کی کبھی کسی سے ہوا فق نہ یہ کمینہ رہا

ب

رہا کرتے ہیں مصروفِ دعا اب نہیں شکوے سے اپنے آشنا لب
نقاہت کی شکایت کیا کریں ہم نہیں آتی دہن سے بات تا لب
مسیحائی مسیحا کر رہے ہیں کہیں تو بھی تو او کافر ہلا لب
مجھے اسکو شبِ فرقت میں دیکھے نہ دیکھے جس نے ہوں اک جان دو قالب
بھرے ہیں مے سے شاید ساغر اس نے مری آنکھیں ہیں اشکوں سے لبالب

خارِ غم سے دامنِ ذی آبرو ہے بے خطر صدمہ سوزن سے ہے محفوظ ملبوسِ حباب
دیکھتا ہے اوجِ موجِ بحرِ ناپیدا کنار ۳۶۔ آشنائی کی ہوا جب تک ہے محبوسِ حباب
جلوہ فرما شب کو ہووے تو لبِ دریا اگر! ہو چراغِ چشمِ ماہی زیبِ فانوسِ حباب

کاسۂ سر پر نہ ہو سنگ حوادث کا نزول　　گنبد گردوں کو گر ہو پاس ناموس حباب

کس آشنا کو بادہ کشتی کی چڑھی ہے لہر　　دریا کھڑا ہے لے کے بکف ساغر حباب
بھر لائے ابر دیدہ و دانستہ اپنی آنکھ　　ہو وے جو خشک چشمۂ چشم تر حباب
لیتے ہی ایک سانس جو میں سرد ہو گیا　　تھی زندگی بھی میری مگر ہمسر حباب

پ

تھوڑے تھوڑے ہوتے ہیں چھوتا ہوں جب　　کیا لجالو ہیں جو شرماتے ہیں آپ

ہے یہی معنی نیاز و ناز کے سمجھیں جناب　　ہاتھ جب ہم جوڑتے ہیں پاؤں پھیلاتے ہیں آپ
جب طلب کرتا ہوں بوسہ سن کے ہو جاتے ہیں چپ　　تشنہ رہجاتا ہوں میں اور بات پی جاتے ہیں آپ

باہر کبھو نہ ہو سکے قسمت کے پیچ سے　　دیکھے جدھر ہزاروں نظر آئے ہمکو سانپ
گیسوئے پیچدار کی دیکھے جو مار پیچ　　جاں اپنی کینچلی کی طرح چھوڑ جائے سانپ
ہے سرزمین شاعرانہ کہ ہے ناگ پھنی　　مضموں کے بدلے شاعروں نے باندھے لاکھ سانپ
ہو فیض کیا جو گرمی کو جلانے لگا ہے فیض　　کچھ اور ذکر چھیڑئیے چولھے میں جائے سانپ

دکھلا رہے ہیں جلوے خلا او ملا میں آپ — ہر چند ہیں متقاصم وراء الورا میں آپ

موقوف غیب پر نہ شہادت پہ منحصر — پھرتے ہیں اپلے گہلے ظہور و خفا میں آپ

ت

اپنی ہو یا کہ ہو پرائی بات — نہیں رکھتے جو منہ پہ آئی بات

کیا غضب ہے بتوں کی محفل میں — نہ کریں ہم کرے خدائی بات

تم سے یوسف علیہ السلام کو کچھ نہیں نسبت — دیکھی یہ وہ سنی سنائی بات

ترے بغیر جو کی ہم نے آہ و زاری رات — محلہ والوں کو سونے دیا نہ ساری رات

خورمی جاتی رہی یوں ہم سے دلگیری سمیت — جائے جوں عہد جوانی موسم پیری سمیت

فکر کے قابو میں ہیں ذی آبرو جوہر سمیت — ۳۸۰ غوطہ زن کے ہاتھ آتی ہی صدف گوہر سمیت

رتبۂ معراج دیتا ہے ہر اک کل جزو کو — آشیاں تک بلبل اڑ جاتی ہے بال و پر سمیت

صحبت ذی آبرو ہے خاکساروں کو مضر — شدت بارش سے گھر گرتے ہیں بام و در سمیت

ٹ

مجھکو فقروں میں کیا اڑاتے ہو — جانتا ہوں جناب کا گھر گھاٹ

جس پہ سوتا ہے آج تان کے تو — چار کے کاندھے کل یہی ہی کھاٹ

ج

جب وصل کی میں عرض کروں کہتے ہو کل آج — کیا فکر کروں دل کو نہیں پڑتی ہے کل آج

ہر بت میں دکھاتا ہوں تجھے شانِ خدا شیخ — کعبہ سے نکل کر طرف دیر تو چل آج

رخسار پہ کاجل کا بنایا ہے تل اُس نے — آتا ہے نظر سہ کے قریں مجھ کو زحل آج

دل لگی کعبے میں ممکن ہی نہیں — ہو رہا ہے پھر ادا اس اپنا مزاج

کچھ نہیں پروا اگر سرکار کا — ہے کبھی تولہ کبھی ماشا مزاج

چ

جمعیتِ خاطر کی اگر تجھکو ہوس ہے ۳۹۰ جوں غنچہ جو کچھ تیری گرہ میں ہے وہ کر خرچ

بیجا نہ کر اس عمر گراں مایہ کو تو صرف — کرتے ہیں بہت دیکھ کے زر اہلِ سفر خرچ

ح

نہیں کچھ لطف تم آئے اگر صبح — بسانِ شمع ہے اپنا سفر صبح

خجل ہے دیکھ زلف و روئے جاناں　　اِدھر شامِ غریباں اُدھر صبح

د

نہ سنے گا کوئی بلبل کا فغاں میرے بعد　　ہوگا سنسانِ گلستانِ جہاں میرے بعد

کیوں نہ اس غم سے لحد ہووے جہنم مجھکو　　کوچۂ یار ہوا رشکِ جناں میرے بعد

جی میں آتا ہے کہ پھر فاش کروں سرِّ وفا　　کون کرتا ہے عیاں رازِ نہاں میرے بعد

ہے تمکو جو انکار ملاقات رہے یاد　　اِس نفی کو کر دینگے ہم اِثبات رہے یاد

دم دے کے سراجی تو لیا آپ نے اچھا　　یہہ داؤ یہہ قابو یہہ نئی گھات رہے یاد

ترے کوچے کی آبادی ہے جن سے　　نہ کر برباد اُنہیں اے خانہ آباد

ہمارے قصرِ دل میں رہئے یکچند　　یہ گھر ایسا خلق میں ہوگا نہ آباد

ذ

آتا ہے نظر شاہدِ معنی کا تماشہ　　غرفہ ہے میرے حق میں مگر روزنِ کاغذ

آہوں سے پریشاں ہے مرا دفترِ ہستی　　بادِ سحری ہوگئی برہم زنِ کاغذ

پرزے گئے پھر کس نے ہیں سیپارۂ دل کے　　آتا ہے نظر سینہ مرا گلخنِ کاغذ

ذی عقل اگر ناز کرے حسن نہیں فیض لایق نہیں انساں کے پیراہن کا غذ

ر

قتلِ عاشق دمبدم ہووے نہ کیوں کارِ نظر تیغِ ابرو تیرِ مژگاں ہیں مددگارِ نظر

کرے جو حکم مرا شہسوارِ عرصۂ حسن چلے ہلال بھی لے کر رکاب میں ترو ار

سر اپنا پھوڑ نہ سختی سے ہجر کی ڈر کر بتوں کا عشق اگر ہے تو دل کو پتھر کر
ارادہ کر نہ پرانی بہشت کا واعظ چل اس کے کوچے میں سیرِ بہشت دیگر کر
کروں یہہ عمل کہ ابھی سر پہ گھر اٹھالوں فیض مگر یہہ ڈر ہے نہ ہو جائیں گوش دلبر کر

رات دن فکر بلند و پست میں گذرے ہے عمر ۱۰ ہم زیرِ پا اپنی زمیں ہے آسماں بالائے سر

ہوتی ہیں باتیں حرف نہیں صوت بھی نہیں اللہ کی زبان ہے گویا زبانِ یار
کرتا ہوں دیر و کعبے کی تعظیم اسی جہت ہے اِن میں نصب سنگ درِ آستانِ یار
نزدیک جب تلک ہے خودی دور ہے خدا تیرا نشاں مٹے تو ملے گا نشانِ یار

فدا ہو جس مسیحائے زماں پر دماغ اس کا ہو چوتھے آسماں پر

بتو آگے خدا کے بھی تمہارا نہ لائیں گے کبھو شکوہ زباں پر

بہار افشاں کی دکھلائے جو وہ مہ کریں جھلمک نہ تارے آسماں پر

ہوئی مٹی خراب اے فیض اس کی جب آیا کوئی میرے امتحاں پر

اسی کے منہ پہ گرتی ہم نے دیکھا اڑائی خاک جس نے آسماں پر

ہر ہر قدم پہ ضعف ہے وہ ناتواں ہوں میں اے مرگ ناگہاں مجھے لے چل سنبھال کر

تو روز باز پرس ہیں دے گا جواب کیا ۲۰۴ ہرگز کسی گدا کا نہ قطع سوال کر

ز

کیسے کیسے ماہ چہروں کو ملایا خاک میں دفتر گردوں کہیں ہوتا نہیں برہم ہنوز

ہو کہیں چنگا الٰہی زخم ناسور کہن ہے مری گردن پہ بار منت مرہم ہنوز

س

نقد کو عجز کی نہ چھوڑ اے فیض یہہ وہ شئے ہے نہیں خدا کے پاس

چشم مست یار کی گردش میں رہتے ہیں مدام ساقیا جاتے نہیں ہیں ہم کبھی ساغر کے پاس

ش

پھر سینۂ سوزاں میں ہوئی مشتعل آتش
شاید کہ دبی تھی تہ دامان دل آتش

ہیں عہد میں پیری کے ہوا راکھ کا تودہ
تھی عشق کی رگ رگ میں مگر مشتعل آتش

کہتے ہیں جسے گرمئی خورشید قیامت
سینہ سے ہوئی تھی مرے کچھ منفعل آتش

ہے قطرۂ خونِ دلِ سوزاں سے مرے فیض
اخگر بجگر اخگر و آتش بدل آتش

حامل بارِ امانت وہ ہوا
کس میں ہے تاب و توانِ درویش

غیر درویش یہ ممکن ہی نہیں
۴۳۰ ہو عیاں رازِ نہانِ درویش

ض

جامِ جہاں نما ہے مرے دل کا آئینہ
جم سے نہ جام سے نہ سکندر سے ہے غرض

جس بت کو فیضِ حسنِ خداداد ہے نصیب
زینت سے کام اسکو نہ زیور سے ہے غرض

باغ سے کم نہیں ہے رشک گلستاں عارض
دہن تنگ ہے غنچہ گل خنداں عارض

چاندنی رات میں تارے جو چھٹکتے دیکھے
آگیا یاد ترا ہمکو پر افشاں عارض

ظ

تھے پہلے کہیں نغمہ و آہنگ میں محفوظ پر اب تو ہیں کنجِ قفس تنگ میں محفوظ

غ

یارب نہ گُل ہو اس گلِ پُر نور کا چراغ روشن اسی چراغ سے ہے طور کا چراغ

آہوں سے اپنا سینہ ہوا دار ہے مکان خاموش ہو نہ اِس دلِ رنجور کا چراغ

ف

غنچہ ساں مٹھی بند ہی رکھ اس چمن میں خوف ہے اعتبار اپنا نہ کھو یاں رکھ کے جوں گُل زر بکف

اے طبیب و ردِ ہجراں مے کی دے پروانگی نرگس بیمار آسا میں بھی ہوں ساغر بکف

سرِ بازار سپہ کیتے ہیں یتیمانِ صدف ہم جنتِ خلد ہے گہوارۂ دامانِ صدف

دامنِ اہلِ تموّل ہے بَری زحمت سے قابلِ بخیہ نہیں چاک گریبانِ صدف

قطرۂ اشک کو پاس اپنے رکھ اے چشمِ نژاد درِ نایاب سے ہے رونقِ ایوانِ صدف

ق

کاکل کے گرفتار ہیں زنجیر کے لایق ابرو کے گنہ گار ہیں شمشیر کے لایق

صیاد مرے حلق پہ رکھتا ہے چھری کیوں ہوں صید زبوں میں نہیں تکبیر کے لایق

رسوائے محبت جو ترے ہیں وہ کسی جا
تعظیم کے قابل ہیں نہ توقیر کے لایق

ک

معلوم ہے حقیقت یارانِ خفتہ بخت
جوں شمع ہم تھے شام سے بیدار صبح تک

خاکساروں کو فیض کافی ہے
بسترِ خاک اور ردائے فلک

ل

وصل کے دن کرونگا آپ سے عرض
قصۂ ہجر ہے نہایت طول

جب سے ہے تیرا مرے جی میں خیال
تب سے ہے دل کا مرے کچھ اور حال

م

آرام سے رہنے نہیں پاتے ہیں کہیں ہم
کیا یاد کریں گے تجھے اے جانِ حزیں ہم ۵۰

اے فیض اگر ساتھ رہیگا دلِ نالاں
آرام سے رہنے کے نہیں زیرِ زمیں ہم

کرتے ہیں یہاں عجب عجب کام
بیٹھے ہوئے بر سرِ سفر ہم

بتخانہ میں جا نکلتے ہیں گاہ
جاتے ہیں گہے خدا کے گھر ہم

خال رخ یار کیوں نہ چومیں　کعبہ کا سمجھتے ہیں حجر ہم
ہے جلوہ نما اِدھر اُدھر تو　کرتے ہیں نظر جدھر جدھر ہم
کچھ کام کی بات یاں نہ سدھری　کیا کر چلے فیض آن کر ہم

آنے نہ دیا جو دیر میں تو　کعبے کی طرف نکل گئے ہم
لہر آئی جو ایک آشنائی کی　فوارہ نمط اچھل گئے ہم
کوچے میں کسی کے ہجر کی رات　گرتے گرتے سنبھل گئے ہم

کیا غم جو آ رہے چمن ماسوا میں ہم　۴۶۰ ہیں محو سیر باغ ورا الورا میں ہم
اپنی کبھی تلاش نہ کی چوک یہ ہوئی　برسوں رہے خراب تلاش خدا میں ہم
مست مئے الست ہیں روز ازل سے لیک　جب سے ملے کسے ہیں پھنسے ہیں بلا میں ہم

کریں ہم کس کی پوجا اور چڑھائیں کس کو چندن ہم　صنم ہم دیر ہم بتخانہ ہم بت ہم برہمن ہم
محبت ہے تو اپنے سے عداوت ہے تو اپنے سے　ہیں آپ ہی دوست اپنے ہم ہیں آپ ہی اپنے دشمن ہم
ہدایت ہم سے ہے پیدا ضلالت ہم پہ ہے شیدا　کبھی ہیں رہنما اپنے کبھی ہیں اپنے رہزن ہم

ہوا اے فیضؔ معلوم ایک مدت میں ہمیں وہ — جپا کرتے تھے جس کے نام کی دن رات سمرن ہم

ہو گئے ہیں ان دنوں کچھ عقل سے معذور ہم — ہے جو نزدیک اپنے اسکو جانتے ہیں دور ہم

جس نے تعلیم انا الحق دی تجھے روزِ الست — ہیں اسی استاد کے شاگردِ اے منصور ہم

عبادت کے بھیس میں کچھ ہم سے بن سکتی نہیں — وہ گئے دن جن دنوں کھٹتے رہتے کچھ مقدور ہم

وائے نادانی کہ ہیں انجام سے کیا بے خبر ۴۷۰ — دو ہی دن کی زندگی پر ہو گئے مغرور ہم

مسئلہ کیا پوچھتے ہو فیضؔ جبر و قدر کا — مدتوں مختار تھے اب ہو گئے مجبور ہم

شافی کی قسم ہے نہیں خواہانِ شفا ہم — بیمار ہیں لیکن نہیں کرتے ہیں دوا ہم

کثرت گہ ایجاد میں بھولے بھی کسی کو — موجود نہیں جانتے ہیں تیرے سوا ہم

ہیں مظہر ہادی و مضل جملہ خلایق ! — کہیئے تو کہیں کس کو برا اور بھلا ہم

پروا نہیں گر شمع نہیں بزم میں اپنی — داغِ دلِ سوزاں کو سمجھتے ہیں دیا ہم

وہ عاشق لیلیٰ ہے تو ہم آپ کے عاشق — انصاف بھی ہے شرط کجا قیس کجا ہم

مست مئے الست نہیں آج کل سے ہم — صدر الصدور بزم مغاں ہیں ازل سے ہم

رہنے دے کوئے یار میں دم بھر تو اے جنون
پھر پھر کے آئے ہیں ابھی دشت وجبل سے ہم

حصن حصین عشق میں آئے ہیں جب سے ہم
فارغ ہیں کفر و دیں کے جنگ و جدل سے ہم

اگر یوں ہی رہیگا آہِ آتش ناک کا عالم ۸۰ تو ہوگا عالم ارواحِ عالم خاک کا عالم

نہ دو تکلیف سیر جلوۂ برقِ تجلی کی
مرے داغِ جگر میں ہے چراغِ طور کا عالم

ن

تھی پریشاں نہ فقط جانِ حزیں تھوڑے دن
ہم بھی وابستۂ کاکل تھے کہیں تھوڑے دن

نقش برآب سمجھ عیش سرائے کثرت
کوچۂ یار میں تھے خاک نشیں تھوڑے دن

ہم اِدہر آہ آہ کرتے ہیں
وہ اُدہر واہ واہ کرتے ہیں

نرم ہے دل ترا مرے نالے
سخت پتھر میں راہ کرتے ہیں

جوں نگیں صفحۂ جہاں پر فیضؔ
نام ہی روسیاہ کرتے ہیں

چلا ہے سیر کو وہ غیرت عروس چمن
اثر کرے نہ کہیں گرمیٔ نفوس چمن

جو ہووے راکب گلگوں وہ غیرت فردوس ۔ نہو عروس بہاری سوار دوش چمن
عرق فشاں ہو اگر فیض چہرہ ساقی کا ۔ حیا کے مارے ابھی بیٹھ جائے جوش چمن

ہے دشمن جاں جب سے دل تنگ بغل میں ۔ ۹۰ رہتی ہے کبھی صلح کبھی جنگ بغل میں
ہے دخل مجھے مدرسۂ عشق میں جب سے ۔ پھرتا ہے رشیدی لئے فرہنگ بغل میں

ہو اپنی آنسوؤں کا جو کاشانہ سنگ میں ۔ پیدا شرر کی جا ہو دردانہ سنگ میں
شیریں کی چشم کا جو پڑے بے ستوں پہ عکس ۔ بنجائے شیشۂ صورت پیمانہ سنگ میں
رخسارۂ بتاں پہ نہو جلوہ گاہ خط ۔ سرسبز ہو نہ سبزۂ بیگانہ سنگ میں
ہر ہر شرر میں برق تجلی نظر پڑے ۔ دیکھے بغور اگر کوئی فرزانہ سنگ میں

جب سے کسی صنم کا افسانہ جانتے ہیں ۔ ہر سنگ و خشت کو ہم بتخانہ جانتے ہیں
اے شمع حسن و خوبی دل ہے وہی ہمارا ۔ محفل میں آپ جسکو پروانہ جانتے ہیں
وہ رشک باغ رضواں جب تک نہ جلوہ گر ہو ۔ ہم روضۂ ارم کو ویرانہ جانتے ہیں
مرقد پہ کوہکن کے اے فیض یوں لکھا ہے ۔ دیوانے ہیں جو مجھکو دیوانہ جانتے ہیں

ہو جو ہاتھ اس حوادث کا ہمکنار آستیں ۵۰۰ کیوں نہ ہو خط شعاعی تار تار آستیں
دیدۂ تر پر مرے دن رات رہتی ہے دھری کیوں نہ دامن سے فزوں ہو اعتبار آستیں
سرمۂ چشم غزالان حرم بن جائیگا فیض صاحب ہم اگر جھٹکیں غبار آستیں

ابروئے یار پر مروں یوں نہ کروں تو کیا کروں تیغ کے آگے سر دھروں یوں نہ کروں تو کیا کروں

سینے میں ضبط آتش غم کب تلک کروں لب تک تو آچکا دل غمناک سے دھواں
اک شمع رو کی زلف کا مارا ہوا ہوں فیض نکلے گا بعد مرگ مری خاک سے دھواں

افتادہ یہ زمیں ہے اور نم بہت ہے یاں نشو و نمائے نخل وفا کم بہت ہے یاں
سوئے بہشت دیکھئے کب ہو روانگی ہم کو فراق حضرت آدم بہت ہے یاں
شکل حباب اپنی ہے اک دم کی زندگی گر ٹھہر جائیں فیض کوئی دم بہت ہے یاں

لخت دل کو مرے سمجھے نہ کوئی چنگاری برق صد طور ہے اس ایک شرر کی تہ میں

پانی میں خاکسار کئی ڈوب جائینگے ۵۱۰ دکھلاؤ آئینے کو نہ چین جبیں کہیں
خوش رکھے حق مسیح علیہ السلام کو صحت ہو تجھکو اے دل اندوہگیں کہیں
جیب سے جنوں کے ہاتھ چڑھی ہے قبائے فیض دامن کہیں ہے جیب کہیں آستیں کہیں

نعمت باغ جہاں سے جسکو نفرت ہے مدام خوردۂ گل کو سمجھتا ہے وہ زر کی تھیلیاں

جلوہ جو اس نے دور سے دکھلا دیا ہمیں برق نگاہ قہر نے چمکا دیا ہمیں
کھیلی جو ہم نے آنکھ مچولی کسی کے ساتھ یاروں نے فیض خاک میں دفنا دیا ہمیں

شکر صد شکر کہ منت کشِ سوزن نہوئے تن پہ اس تیغ کے دو چار جو تھے گھاؤ کہیں
کس لئے کھینچتے ہو شہرِ بتاں میں تکلیف ملک اللہ کا ہے فیض چلے جاؤ کہیں

کسی کی لو میں کب داغ دل بیتاب ہے روشن درونِ سینہ اک خورشیدِ عالمتاب ہے روشن
اوٹھاؤں کسلئے اے یار کوہِ طور کی منت تری خاک قدم سے دیدۂ بیخواب ہے روشن
نہیں کچھ احتیاج شمع فیض اس بزمِ عالم میں ۵۲۰ فروغ داغ دل سے خانۂ احباب ہے روشن

اے ناخدا تجھے اب کیا ماجرا سنائیں اس بحرِ غم میں ہم بھی ٹوٹی سی ناؤ پر ہیں

تجویزِ نسخہ ناحق کرتے ہو اے مسیحا بیمارِ چشمِ جاناں اب چل چلاؤ پر ہیں

اے مرغِ دل بچھا کر دامِ فریب ہر سو اس صید گہ میں جو ہیں سب اپنی داؤ پر ہیں

تفویض کوئی عہدہ سرکار سے نہیں ہے نوکر بتوں کے یاں ہم بس آؤ جاؤ پر ہیں

کوئی دن جینے غمِ آتش فشاں دیتا نہیں فرصت اک دم کی مجھے سوزِ نہاں دیتا نہیں

تا کجا گردش نہ ہوا اے مہر ہم کو بھی یہاں کونسا دن ہے کہ چکر آسماں دیتا نہیں

میں در اہلِ دول پر نہ کبھی سر ماروں گنجِ قاروں بھی اگر ہو تو نہ ٹھوکر ماروں

دعوئے شعلہ فشانی جو کرے رخ سے ترے بزم میں شمع شبستاں کو جلا کر ماروں

قطرہ آجائے عرق کا جو ترے عارض پر میں ابھی دیدۂ خورشید میں کنکر ماروں

فیض اگر لختِ جگر نوکِ مژہ پر ہو نمود ۵۳۰ رگ جان و دل یاقوت میں کنکر ماروں

مرتا ہوں دردِ عشق سے پیدا دوا نہیں دار المرض یہ دہر ہے دار الشفا نہیں

دستِ طلب کریم نے ہم کو دیا نہیں وابستہ آستین سے اپنی قبا نہیں

ہو تو بھی خاک راہ کسی خاکسار کا
بہتر جہاں میں اس سے کوئی کیمیا نہیں

عنقا کی طرح گوشہ نشینی کر اختیار
جز نام یاں نشان کسی کا رہا نہیں

اے رہرو مقام فنا فکر کوچ کر
آوازِ الرحیل ہے بانگِ درا نہیں

جن ہیں انساں ہیں پری ہیں حور ہیں
آپ ہر ہر شان میں مستور ہیں

ہے ترقی و تنزل کا یہہ کھیل
کل تھے مختار آج ہم مجبور ہیں

حال سنئے ان کے قرب و بُعد کا
جان سے نزدیک تن سے دور ہیں

کعبہ میں کیا ہے اور شوالے میں کیا نہیں
پر چشم حق شناس تجھے واعظا نہیں

ہیں مبتلا دوئی میں یہہ سب زاہدانِ شہر ۔ ۵۴۰ ان احولوں کو ایک کبھی سوجھتا نہیں

کیا کفر ہے مقیم جو ہم دیر میں ہوئے
وہ کون سا مقام ہے جسمیں خدا نہیں

بتلاؤنگا خدا کا پتہ کیا کسی کو میں
معلوم آج تک مجھے میرا پتا نہیں

غیر حق پر مری نگاہ نہیں
بت بھی پوجوں تو کچھ گناہ نہیں

بحر الفت کی رہ کنارے پر
یہہ وہ دریا ہے جسکو تھاہ نہیں

آنکھ میری ابھی لگی ہے یہاں   اے دل زار بس کراہ نہیں
مغفرت کی امید میں اے فیضؔ   ہم سے چھوٹا کوئی گناہ نہیں

ایسے جینے کی ہم کو چاہ نہیں   شاہد اگر ہے تو پھر نگاہ نہیں
آہ سوزاں اثر کرے کیا خاک   گو غم ہے یہ پر گناہ نہیں

دھو کے ہیں آب کے ہے فنا کیوں سراب میں   ہے اقتباز شرط حیات و حباب میں
ان ابروؤں کا عکس گرے گر شراب میں .۵۵ آئیں کئی ہلال نظر آفتاب میں
مجھکو ہوائے بادہ کشی نے کیا شہید   تاثیر تیغ تیز ہے موج شراب میں

واعظو کیا حصول بک بک سے   ہم سے بگڑے کہیں سدھرتے ہیں
ہووے جس موت میں خوشی انکی   ایسے مرنے پہ ہم تو مرتے ہیں

جب سے وہ یار اپنے پاس نہیں   دل ٹھکانے نہیں حواس نہیں
آتش ہجر کا سمندر ہوں   نار دوزخ سے کچھ ہراس نہیں

رخ روشن نہاں ہے آنچل میں بجلیاں کوندتی ہیں بادل میں
حسن کیا چیز عشق کیا شے ہے نہیں آتا کچھ اپنے اٹکل میں
ہم بھی در پردہ مر ہی جائینگے گر یونہی وہ رہیں گے اوجھل میں

ہلالِ عید ہے ساقی نمود بادل میں مہ صیام گیا لا شراب بوتل میں
گئی نہ موسم پیری میں بھی حرارت عشق ۔ دبی رہی کئی برسوں یہ آگ بھوبل میں

کہیں تم سے کیا ہم زمانے کی باتیں کرے ہے ٹھکانے لگانے کی باتیں
سنیں پند گویوں کی کیا واہیاتیں نہیں بادان کو ٹھکانے کی باتیں
کبھو ذکر کوثر کبھو ذکر جنت کیا کرتے ہیں پینے کھانے کی باتیں

مردودِ خلایق ہیں کہ مقبول خدا ہیں اب تک نہیں معلوم ہمیں کون ہیں کیا ہیں
ہم تم ہیں اسی پردے میں جس وقت یہ اٹھ جائے کچھ اور ہی عالم ہے کہاں ما و شما ہیں
اک بینی و دو گوش نہیں معنئ انساں انسان جنھیں کہتے ہیں وہ لوگ جدا ہیں
آغاز سے آگاہ نہ انجام سے واقف افسوس کہ ہم لوگ بھی کیا بے سر و پا ہیں

ارباب ظواہر سے نہ کچھ پوچھ حقیقت
یہہ لوگ ہیں خوش لفظ سے معنی سے خفا ہیں

کہتے ہیں جسے علم وہ ہے ایک ہی نکتہ
اس رمز سے آگاہ اگر ہیں فقرا ہیں

لے کے جان و دل مکرتے ہیں مکرنے دو ہمیں ۔ ۵۷ مجھ پہ وہ جو جو ستم کرتے ہیں کرنے دو ہمیں

اپنے ہونٹوں کو مسیحائی کا فرمائیں نہ کام
بے اجل عاشق اگر مرتے ہیں مرنے دو ہمیں

باغ ہو یا راغ ہو بستی ہو یا ویرانہ ہو
لاش میری وہ جہاں دھرتے ہیں دھرنے دو ہمیں

دل کے بدلے ہوئے اطوار نظر آتے ہیں
جان دینے ہی کے آثار نظر آتے ہیں

ناز و انداز و ادا عشوہ کرشمہ غمزہ
مجھکو قاتل یہی دو چار نظر آتے ہیں

زلف و رخسار بتاں کی ہے کرامت ظاہر
معتقد کافر و دیندار نظر آتے ہیں

ڈھانہ دل کا قصر بن سکتا پھر ایسا گھر نہیں
یہہ عمارت وہ ہے جس میں خاک و تپھر نہیں

ہے لب جان بخش جاناں چشمۂ آب حیات
زندگی سے ہاتھ دھونا کچھ مجھے دوبھر نہیں

خلق کہتی ہے سو اد الوجہ فی الدارین اسے
فیض جو وابستۂ گیسوئے پیغمبر نہیں

خاکساری سے بھلا کیوں کر نہو رغبت ہمیں | ایک دن ملنا ہے مٹی میں بہر صورت ہمیں
اور کچھ اصلا نہیں ہے غم دم رحلت ہمیں ۰۸۵ ہے یہی رونا کہ مرنے کی نہ تھی عادت ہمیں

اس بحر کے ناخدا ہیں بے رحم | کس کو اس پار اتارتے ہیں
اے فیض وہ بد ہوں نیک و بد سب | توبہ توبہ پکارتے ہیں

اے جنوں موسم بہار آیا | چاک ادھر جیب ہے اُدھر دامن
دور ہے چشم مست ساقی کا | زاہد خشک بھی ہے تر دامن
قتل میں قاتل احتیاط ہے شرط | تا لہو میں نہ جائے بھر دامن

الیاس و خضر جن کے لئے بحر و بر میں ہیں | دن رات جلوہ گر وہ مری چشم تر میں ہیں

عاشق چہرہ جاناں ہوں میں | للہ الحمد مسلماں ہوں میں
شخص اور عکس کو پہچانوں کیا | صورت آئینہ حیراں ہوں میں
جس کو ہو آنکھ وہ دیکھے اے فیض | مردم عین ہوں انساں ہوں میں

کلام لا میں ہے الا میں کچھ کلام نہیں ۵۹۰ خدا سے کام ہے ہم کو بتوں سے کام نہیں
سوار کے وہ رہے اختیار میں کیونکر سمند عمر رواں کے لئے لگام نہیں

مشکیں باندھو کوڑے مارو ہم کو جو چاہے کرو قیدی زلف مسلسل ہیں گرفتار و نہیں ہیں
بے جہت شیخ و برہمن کیوں کھنچے رہنے لگے عاشق اپنے ہم ہیں کافر ہیں نہ دیندار و نہیں ہیں
ہے خدائے بے نیاز اے برہمن اس کا گواہ ہم ازل سے ان بتوں کے ناز بردار و نہیں ہیں
آپ ہی آتے نظر ہیں دیکھتے ہیں جس طرف نصب آئینے ہمارے گھر کی دیوار و نہیں ہیں

تمہاد ہی ہر بھیس میں ہر روپ میں صورت اسکی تم نے پہچانی نہیں
روز اول سے یہی ہم کہتے ہیں تو ہے لاثانی ترا ثانی نہیں
اپنے رب کی قدر کیا جانے گا وہ قدر جس نے نفس کی جانی نہیں
شیخ صاحب جب گیا دل سے نفاق دین میں پھر وجہہ حیرانی نہیں
صاف رکھنا دل کو آئینے کی شکل ۶۰۰ کیا یہہ آئین مسلمانی نہیں
وصل روحانی تو ہے فیض انکے ساتھ غم نہیں گر وصل جسمانی نہیں

ہم ہیں بیگانے پوچھتا ہے کون
وہ ہر ایک آشنا سے لڑتے ہیں

موت آتی نہیں شب فرقت
کشتیاں ہم قضا سے لڑتے ہیں

ہیں جو قابل وجود مطلق کے
کب وہ ماوشما سے لڑتے ہیں

قتل کی میری گواہی تری آنکھیں کیا دیں
مست و مخمور ہیں یہہ شاہد عادل دونوں

یار سفاک نے جس روز پڑہی بسم اللہ
للہ الحمد دل و جاں ہوئے بسمل دونوں

حق پہ تھے وامق و فرہاد مگر حسن یہہ ہے
ہو گئے محکمۂ عشق میں باطل دونوں

غیر سے وہ نہ ملیں مجھ سے ہی رکھیں اخلاص
فیض آساں نہیں یہہ کام ہیں مشکل دونوں

ایک ہی چیز میں مشغول بھی شاغل دونوں
دیکھ لیں آئینہ کو رکھ کے مقابل دونوں

حشر تک حل نہوں ارباب ظواہر سے کبھی
جبر اور قدر کے ہیں مسئلے مشکل دونوں

دیکھ لے دیدۂ حق بیں سے اگر شک ہے تجھے
عین ہیں غیر نہیں واجب و ممکن دونوں

کس کو چھوٹا کہوں اے فیض کہوں کس کو بڑا
کفر و دیں ہیں مری دانست میں ہمسن دونوں

و

ہے وہ پری یا حور ہے نزدیک ہے یا دور ہے
وہ کونسا مغرور ہے تم جیسے یاں شیوں میں ہو

تری قبا میں ہی جو اب وہ بوئے خوش ہے اغنچہ لب | یہہ بھینی بھینی باس کب ہے گُل کے پیرہن میں ہو
بے لطف ہے خلد بریں کس کام کی ہی حورِ عین | جب دل ہی پاس اپنے نہیں کیا خاک پھر گلشن میں ہو
رنج و تعب کھینچا کریں فرمایئے کیا کیا کریں | سو حشر ہم برپا کریں جب تم نہ اس مسکن میں ہو

سوسن و گل کی طرح گوش و دہان ہے مجھ کو | کہنے سننے کا مگر ہوش کہاں ہے مجھ کو

آج تم نکلو خواہ کل نکلو | غرض اس کارواں سے چل نکلو

جو کسی کو مکتبِ عشق سے ذرا بھی علم حصول ہو | کبھو مصحفِ رخ یار کی نئی یا نشان نزول ہو
پئے انفصال دلِ حزیں پئے عرضِ حال دلِ حزیں ۶۲۰ | سوئے زلف یار چلا تو ہوں کہیں قیض قصہ طول ہو
پئے جستجوئے گذشتگاں نظر آئے ہی دلِ عاشقاں | کہیں آب ہو کہیں آگ ہو کہیں باد ہو کہیں دھول ہو

شبہ تم کو نہ تو ہم مجھ کو ! | جانتا ہیں ہوں تمہیں تم مجھ کو
زلف والوں نے بر نگ شانہ | کر دیا صرف تبسم مجھ کو
نہ ہلوں جب تئیں وہ لب نہ ہلیں | گر مسیحا بھی کہے قم مجھ کو

دماغ کیا کرے آ گے ترے چمن کی بو — قبائے گل میں ہے تیرے ہی پیرہن کی بو
نہ لخلخے کی ہوس ہے نہ مشک کی پروا — دماغ میں ہے مرے زلفِ پرشکن کی بو

ہ

آب گل صفحۂ گل پر لکھا دیکھا ہوں میں — کب کھلے سوچ صبا سے غنچۂ غم کی گرہ
وصفِ زلف و خال اگر آوے لب پر جوش تک — کھل ہی جائے پیمان پیالہ زمزم کی گرہ
جلوہ گر ہے تکمۂ زرین کسی کی جیب سے — یا گریبان سحر سے مہر کی چمکی گرہ

مجنوں کے تجسس میں جو میں نجد سے گزرا ۶۳۰ بھر آئی مری آنکھ بیاباں کی طرف دیکھ
ڈرتا ہوں نہ لگ جائے نظر عکس کی تجھکو — مت آئینہ میں عارضِ تاباں کی طرف دیکھ

ی

گو بہت دنیا میں ہیں محنت کشیدہ آدمی — ہم سے کم ہوں گے مگر آفت رسیدہ آدمی

ذکر ابرو تھا کہیں تقریر کچھ ایسی نہ تھی — منفعت ہیں مارا گیا تقصیر کچھ ایسی نہ تھی
دور ہو جاتے جھٹکنے سے ہوائے غیرت شعار — خاک فیضِ زار دامنگیر کچھ ایسی نہ تھی

گرے جھٹ چاروں شانے چت فرشتے پھسل ہنڈا ہی بابل کی زمین تھی!

تصور آپ نہ کیجے کبھی بگولے کا ہوا یہ ہے کسی گم کردہ راہ کی گٹھڑی
خدا ہی جانے کہ بازارِ حشر میں کیا ہو اٹھا کے سر پہ چلا ہوں گناہ کی گٹھڑی
دھرا جو فیضؔ کی چھاتی پہ سنگِ مرقد ہے وہی تو ہے دلِ غفراں پناہ کی گٹھڑی

اچھی کہانی رات کہی زلفِ یار کی ہو وے دراز عمر دلِ بیقرار کی

ہے کسی پردہ نشیں کا ہمکو عشق ۶۴۰ اس لئے ہم شمع ہیں فانوس کی

سوتیا کی شاخ کس کے ہاتھ کی آتی ہے یاد ہر مژہ پر یوں جو آجاتا ہے آنسو ہر گھڑی

جائے اکسیر ہے مِس دل پر یار کے آستان کی مٹی
جلد یاں سے نکل کہ جھڑتی ہے گنبدِ آسمان کی مٹی
کردیا پیرِ چرخ نے برباد فیضؔ سے نوجوان کی مٹی

بخدا اے بت سفاک تری چتون سے — کونسا دن ہے کہ چھاتی نہ چھپی ہیرے کی

اپنے سینے کا فقیروں نے بنایا تعویذ — کیا ہی توقیر ہے اللہ غنی ہیرے کی

دل تڑپتا تھا برنگ طائر قبلہ نما — یاد ہے اے کعبۂ مقصود مہجوری تری

غنچۂ پیکاں کسی کا زخم نشیں سینہ میں ہے — کب مرے دل میں جگہ ہوئے گل سوری تری

فیض کے داغ جگر کا گر نہیں تھا امتحاں — شب کو انگلی جل گئی کیوں شمع کافوری تری

خروش و جوش میں جو موج آستیں نہ رہی ۶۵۰ دیار عشق کی سیراب سرزمیں نہ رہی

برنگ سرمہ ہمیں فیض ہجر نے پیسا — جب اپنے پیش نظر چشم سرمگیں نہ رہی

اس چشم بفتن کا بیمار نہ ہوجائے — یہ رند ملامت کش پھر زار نہ ہو جائے

رکھ گلوئے خشک پر اس نیم جاں کی آج تو — اے بت سفاک خنجر میں تری گر آب ہے

آتش گل کو کرے گی فائدہ کیا سیل اشک — لگ رہی ہے گھر کے اندر آگ باہر آب ہے

آشناؤں نے جسے سمجھا ہے بحر بیکراں — فیض چشم زار سے وہ ایک ساغر آب ہے

ہر غنچہ خجالت سے جو سر بگریباں ہے — چرچا یہ چمنستاں میں کس تنگ دہن کا ہے

جب تک تھے اُس کے پاس کمینے نئے نئے — کیا کیا ستم سہے مرے جی نے نئے نئے
یہ بھی خدا کی شان ہے اشراف ہیں یہاں — تعظیم چاہتے ہیں کمینے نئے نئے

جدائی تری میری کیا اے نکو ہے — جہاں تو ہے میں ہوں جہاں میں ہوں تو ہے
نہ کیوں شیشۂ دل مرا چور ہووے — ۶۶۰ دہرا آئینہ یار کے روبرو ہے
شبِ وصل گریاں شبِ ہجر خنداں — جہاں سے نرالی مرے دل کی خو ہے

اے نسیم سحری کھول اگر تجھ سے کھلے — غنچہ ساں ہم بھی ہیں ایک عقدۂ مشکل والے
غرق گرداب فنا ہو جو مری کشتئ عمر — سر کو جوں موج پٹکتے رہیں ساحل والے

طایر سدرہ نشیں کا بھی ادھر ہی رخ ہے — حلقۂ زلف ہے یا دام بلا ہے کیا ہے
لذت قند مکرر ہے شب وصل مجھے — پوچھنا آپ کا تکرار سے کیا ہے کیا ہے
یاالٰہی مرض عشق جسے کہتے ہیں! — دل کو میرے وہی آزار ہوا ہے کیا ہے
فیض کو پھر ہوس کوچۂ سفاک ہوئی — نہیں معلوم وہاں اسکی قضا ہے کیا ہے

مصلح کس لئے ہوتے ہو بے وسواس آ بیٹھو — جو دل ہی لے نہیں سکتے ہیں پھر ہم تم سے کیا لینگے
نہ اٹھنے دینگے پہلو سے ہم اپنے صبح محشر تک — بٹھا لینگے تجھے عالم کی رسوائی اٹھا لینگے

ہم اپنے فیض سے رونے کے سو سو بار دریا کو ۰ ٦٧ بڑھا لینگے گھٹا لینگے گھٹا لینگے بڑھا لینگے

کس طرح پہونچائیے تیرے بام پر اپنے کو وہ — طاقت بال و پر روح الامیں تھوڑی سی ہے
ہم بھی اس وسعت جنانی کو کہیں کرتے تحمل — تر لہو ہے لیکن اپنی آستیں تھوڑی سی ہے

بغیر از ناخن ابرو نہ سلجھیگی نہ سلجھے گی — گرہ الجھی ہوئی دل کی کہیں کا کل نکالیگی
ہمیں تو فیض سو سی کچھ نہ تحمل طور سے ہوگا — حجاب چشم دل خاک رہ دلدل نکالیگی

دیر میں صبح شام کعبے میں — کل وہاں بیٹھے آج یہاں بیٹھے
نہ اٹھے وال سے ہم وہیں کے ہوئے — شکل نقش قدم جہاں بیٹھے

مہ نو کا ہے ناخن تیز لیکن — خجل ہے عقدہ مشکل سے اپنے
کرے گا تلخ عیش اہل محفل — بنے ساغر جو آب و گل سے اپنے

سیل چشمِ زار جس دم بہہ گئی — اک بڑی دل کی عمارت ڈہ گئی
تھا مصمّم قصد لیکن کیا کرے ۶۸۰ — ضعف سے جب تابِ طاقت رہ گئی
یوں جو کانوں پر کفِ پا ہے رواں — آبلہ پائی کی زحمت سہہ گئی
جلوہ گر جب عارضِ جاناں ہوئے — رونق رخسارِ مہر دہ گئی

بہر غمخواریٔ دل کوئی نہیں سینے میں — کھینچ مت تیر کو جراح مرے پہلو سے
جائے افسوس ہے بولے نہ اگر حق اللہ — گفتگو شیخ نے سیکھی ہے یہاں ہٹھو سے
کیوں نہ سینے سے دھواں نکلے جو وحشت ہو فزوں — گرد اٹھے ہے بیاباں میں دمِ آہو سے

خال کو جب سے ترے رخ کی نگہبانی ہے — یاں ہر اک مور کو دعوائے سلیمانی ہے
لاکھ تدبیریں کریں ایک نہیں بن آتی — پیش آتی ہے جو تقدیر کی پیش آنی ہے

جنوں کی کارفرمائی غضب ہے — ہماری بے سروپائی غضب ہے
سیانوں کو بھی دیوانہ بنایا — پریزادوں کی مرزائی غضب ہے

اِس دشت ہولناک سے جو خونریز ہے ۶۹۰ جگنو تمام رات اوسے چشمِ شیر ہے

کچھ بھی ہوا نہ سلطنت فقر سے حصول
کشتی پر اپنی صدمۂ موج حصیر ہے

ملتا ہے منہ پہ خاک سدا مثل آئینہ
اے یار جس کو شوق صفائے ضمیر ہے

داغ بر داغ کھائے جو دل نے
آرزو تھی گل جوانی کی

کوہ غم کو اوٹھا کے ہم نے بھی
ناتوانی میں پہلوانی کی

سر کو میری طرح سے ٹکراتی
اے صبا اس گلی میں تو نہ گئی

صبر و تاب و تواں مرے دل سے
سب گئے تیری آرزو نہ گئی

دیوانہ بہت کون ہے انصاف تو کیجے
دیکھا ہے مجھے آپ نے مجنوں کو سنا ہے

صدمے تو بہت ہم نے اٹھائے ہیں پر آگے
اللہ کو ہے علم کہ تقدیر میں کیا ہے

زمین شعر وہ ہموار ہے کہ اس جا گہ
کبھو نہ توسن فکر بلند و پست اڑے

کدھر ہے دیدۂ محمود اور کہاں ابرو ۷۰۰ بزیر طاق حرم میں آئے پرستش کے

برنگ فیض کسی غنچے کی جو گھٹ پر | ازل سے ہم بھی ہیں پی کر ئے الست اٹھے

مجھے اے فیض دہقان فلک مانند سبزے کے | کبھو سرسبز کرتا ہے کبھو پامال کرتا ہے

اوج موج دریا سے کچھ نہیں ضرر مجھ کو | کوئی دم حباب آسا یاں مری اقامت ہے

چراغ داغ دل سوختہ جو ہو روشن | پتنگ پھر کہیں آنکھوں کو سینکتا نہ پھرے
جو ہو طمانچۂ موج نسیم سے آگاہ | حباب سر پہ لئے کاسۂ ریا نہ پھرے
کلاہ فقر پہ نازاں ہوں میں بدولت عشق | سر نیاز پہ میرے کبھی ہما نہ پھرے
خیال خواب عدم گر نہ ہو گریباں گیر | تو آنکھ ہو نہ کبھی یاں کوئی بلبلا نہ پھرے
نہ ہووے دیدۂ صبح وطن کبھو روشن | غبار گور غریباں کبھو اڑا نہ پھرے

آرزوئے آب خنجر ہے مجھے | بس یہی اک بادجو ہر ہے مجھے
زخم دل یہ چنگا کہیں ہوتا نہیں ۱۰۷ | زندگی بھی اب تو دوبھر ہے مجھے

کوچۂ قاتل میں سو سو بار سر کے بل گیا | میرے طفل اشک کے شاید کہ سر پر پاؤں تھے

پانی کی نہر، نہر بنے گی گلاب کی | رخ سے عرق ترے جو لب جو ٹپک پڑے
فیضؔ اپنی آنکھ سے لب دنداں کے دہیان میں | مرجاں ٹپک پڑے ہیں کہیں لو لو ٹپک پڑے

کیا خوش نصیب ہیں ترے عاشق جو اوگے گھر | آتی ہے روز ایک بلا آسمان سے
اے فیضؔ مجھ سے پوچھ نہ کچھ حال رفتگاں | جوں گرد دور دور ہوں میں کارواں سے

جب سے پیش نظر اس یار کی پیشانی ہے | صورت آئینہ حاصل مجھے حیرانی ہے
خلعت بادشہی خلعت عریانی ہے | سروسامان مرا بے سروسامانی ہے
خاکساری کسے کہتے ہیں کوئی کیا جانے | ہم نے ہٹی ترے کوچہ کی بہت چھانی ہے
نغمہ سنجی تری اعجاز سے اے غنچہ دہن | مرغ تصویر ہر اک مرغ گلستانی ہے

زخمی ہر ایک گل جو چمن کی فضا میں ہے | ۲۰، تاثیر تیغ موجۂ بادِ صبا میں ہے
کیا دیکھتا ہے نقش و نگار حریر کو | مضموں کچھ اور سطر خط بوریا میں ہے

بت غنچہ لب پھر ہنسا چاہتا ہے | خدا جانے کیا گل کھلا چاہتا ہے

چمکتا ہے داغ کہن پھر سر نو — مرا نام روشن ہوا چاہتا ہے

مار ڈالا مجھے فرقت نے قضا سے پہلے — ہو گیا کام ادا اُن کی ادا سے پہلے

سبقت احسان کو ہے انکے مرے عصیاں پر — عفو کرتے ہیں خطا کو وہ خطا سے پہلے

ہم نے سکھلائے ہیں اندازِ وفا و اخلاص — آگہی کب تھی انہیں رسمِ وفا سے پہلے

کیوں نہ تقدیم مرے کفر کو اسلام پہ ہو — بت کلیسا میں نظر آئے خدا سے پہلے

فراق یار میں زاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے — تجھے چلنے سے بے آزاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

شبِ غم کی وہ تنہائی، نہ خواب آیا، نہ موت آئی — وہ بدخوابی وہ بیداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

زمانہ ہو گیا آخر ولیکن نام ہے روشن — کرامت فیض کی جاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

جلانا مارنا عاشق کا اپنے انکو یکساں ہے — نگہ میں زہرِ قاتل ہے لبوں میں آبِ حیواں ہے

مرا اور طائرِ تصویر کا ایک ہی فسانہ ہے — نہ فکر آب و دانہ ہے نہ فکرِ آشیانہ ہے

ہر ایک شیخ و برہمن ڈھونڈھ رہا ہے جسکی آوارہ — نہ ٹھور اسکا کلیسا میں نہ کعبہ میں ٹھکانہ ہے

کروں کیا فکر زاری سے بھی مطلب بن نہیں آتا بہانا آنسوؤں کا یار کے آگے بہانہ ہے

یار نے ہم سے رہ و رسمِ وفا بدلی ہے اس پہ کیا دوش زمانہ کی ہوا بدلی ہے

چھوڑ دے منہ پہ نقاب اے مہِ خوبی چندے رونق چہرۂ اربابِ صفا بدلی ہے

ہنستے ہنستے ہی رلانا ہے مجھے وہ محبوب وضع بدلی نہیں پر طرزِ جفا بدلی ہے

ہر برہمن بھی دید کا مشتاق ہے سو ہے اس بت کو پاس خاطرِ عشاق ہے سو ہے

مستور سو حجاب میں اسکا ہے رخ مگر حسن و جمال شہرۂ آفاق ہے سو ہے

سو سو طرح کے رنج ہمیں ہجر میں ہیں لیک مشتاق وصل یہ دل مشتاق ہے سو ہے

پیشِ نگاہ مجمع تقیید ہے تو کیا دل کو خیال عالم اطلاق ہے سو ہے

لڑ رہی ہے آنکھ میری ایک بہشتی حور سے دیکھتا رہتا ہوں جنت کا تماشہ دور سے

مشتعل آتش ہوئی دامانِ کوہِ طور سے بجلیاں تم نے گرائیں عارضِ پرنور سے

کیا برے دن ہجر کے ہیں بھاگتے ہیں سب رفیق چاہتی ہے جان بھی رخصت تنِ مہجور سے

ہجر کی شب آگ برساتی ہے مجھ پر چاندنی دھوپ ہو جاتی ہے میرے گھر میں آ کر چاندنی

دھوپ دن کو سر پٹکتی ہے در و دیوار سے ۔۔۔ ڈوہ میں تیری پڑی پھرتی ہے شب بھر چاندنی

دل تنگ پڑے رہتے ہیں کونے میں چمن کے ۔۔۔ ہیں ہم بھی ہوا خواہ کسی غنچہ دہن کے

کرتا ہوں ابھی سرو کو سیدھا ترے آگے ۔۔۔ دو چار قدم چل تو سہی باغ میں تن کے

مرغ روح عاشقاں کو خواہشِ پرواز ہے ۔۔۔ پنجۂ مژگانِ قاتل چنگلِ شہباز ہے

ذی تلوں اوج مقصد تک پہنچ سکتا نہیں ۔ ۵ ۔ اِس گلستاں کا ہر اک طاؤس کم پرواز ہے

گر بزرگی کی ہوس ہے کر نہ منت خلق کی ۔۔۔ موجب عزت جہاں میں ترک حرص و آز ہے

ہے تصور ساقیٔ مخمور کا ۔۔۔ ہر گھڑا پڑتا ہے ساغر ہے مجھے

مرنے جینے کا نہیں غم عشق میں ۔۔۔ نیستی ہستی برابر ہے مجھے

آستانِ یار پر وحشت ہوئی ۔۔۔ چشم آہو حلقۂ در ہے مجھے

فیض زیرِ خاک بھی ہوں باغ باغ ۔۔۔ داغ تن پھولوں کی چادر ہے مجھے

ہماری خاک ہے ریگِ رواں بیاباں کی ۔۔۔ دمِ خرام کرو احتیاط داماں کی

مرے تن پہ وحشت میں کیا خاک ہے غبار رہِ یار پوشاک ہے

نہ دو مسیح علیہ السلام کو تکلیف مریض عشق ہوں کیا احتیاج درماں کی
اوڑائیں مصر میں خاک کہ جناب یوسفؑ بھی شبیہ دیکھیں اگر میرے ماہِ کنعاں کی

دل کسی کو دے کے میرا حالِ دل ۷۶۰ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھئے
ہے خدا موجود ہر موجود میں غور سے اے بندہ پرور دیکھئے
ہے یہ پہچانت زر و انسان کی کس کر اُسکو اِسکو پس کر دیکھئے
گور کی صورت دکھائی موت نے آرزو تھی یار کا گھر دیکھئے
جلوہ گاہِ یار ہیں دونوں مکاں دیر و کعبہ کو برابر دیکھئے
رشک اربابِ حسد نے دل کے فیضؔ کر دئے ٹکڑے بہتر دیکھئے

تم ہو مختار جو کچھ چاہتے ہو کرتے ہو میں ہوں مجبور میرے ہاتھ سے ہوتا کیا ہے
کل پہ موقوف نہ رکھ آج ہی کر لے سب کچھ زیست کہتے ہیں جسے اسکا بھروسہ کیا ہے
ہوں تو مخلوق مگر آئینۂ خالق ہوں مجھکو اے فیضؔ ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے

گیا کیا تو نے اس عالم میں آکے ۔۔۔ سمجھ جا اب بھی او بندے خدا کے
نہیں آتے ہیں بندہ کی سمجھ میں ۔۔۔ عجب کچھ کارخانے ہیں خدا کے

ہے وہ تو پاس کہتی ہے تو جسکو دور ہے ۔۔۔ اے عقل بے خبر تجھے کچھ بھی شعور ہے
جب ٹھہری یہہ کہ سہو و خطا ہے سرشت میں ۔۔۔ ہم سے اگر قصور بھی ہو کیا قصور ہے
یہ طمطراق زندگیٔ مستعار پر ۔۔۔ اے مشت خاک تجھکو بھی کتنا غرور ہے
کس طرح امتیاز بد و نیک کیجئے ۔۔۔ جس جائے دیکھئے تو اسی کا ظہور ہے

بے شعور دل کو ہے راحت بیقراری میں حصول ۔۔۔ باعث آرام طفلاں جنبش گہوارہ ہے
کر صفت پیدا اگر منظور ہے سیر جہاں ۔۔۔ ہے بصارت جب تلک کیفیت نظارہ ہے

بحر مواج ہر حباب میں ہے ۔۔۔ عین بے پردگی نقاب میں ہے
ہیں محیط و محاط دونوں ایک ۔۔۔ آب گوہر میں گوہر آب میں ہے
اپنی غفلت ہے عین بیداری ۔۔۔ آپ ہی کا خیال خواب میں ہے

دل میں اشکوں نے آگ ڈالی ہے ۸۰، مینھ برستا ہے خشک سالی ہے

ہر قدم پر بپا ہے فتنۂ حشر! اُن کی رفتار کچھ نرالی ہے

تنِ خاکی فنا ہوا تو ہوا باقی اپنا تنِ مثالی ہے

فیضؔ کچھ فکرِ معصیت کی نہ کر اس کی درگاہ لاابالی ہے

جب سے نزدیک اُنکے ہم رہنے لگے دور ہم سے رنج و غم رہنے لگے

گھر خدا کا جس کو ہم سمجھے تھے فیضؔ اب تو اس گھر میں صنم رہنے لگے

جب تلک جیتے ہیں مے سے کام ہے سرنوشت اپنی بخطِ جام ہے

گلشن ایجاد ہے ماتم سرا بانگِ بلبل مجھ کو اذنِ عام ہے

ہے کمالِ زندگی آخر زوال یاں ہر ایک آغاز کا انجام ہے

دل کو پھر اضطراب ہوتا ہے دہر میں انقلاب ہوتا ہے

جب وہ مستِ شراب ہوتا ہے ۹۰، اک زمانہ خراب ہوتا ہے

ایک تیرے نہ ہونے سے مجھ پر سو طرح کا عذاب ہوتا ہے

روزِ الست کس کی مجھے بد دعا لگی — جونہی ملے کہا ہمیں پیچھے بلا لگی
یارانِ ہم سفر کو یقیں موت کا ہوا — اس قافلے میں آنکھ جو میری ذرا لگی

حال ظاہر کیا کریں ما و شما کے سامنے — بت کے بندہ ہیں کہیں گے ہم خدا کے سامنے
مار ڈالا ہے مجھے عشقِ لبِ جاں بخش نے — لاشہ دفنا دو مرا دارالشفاء کے سامنے

ہو کیوں نہ میکشوں کا دماغ آسماں پر — مئے آفتاب ہے خط ساغر ہلال ہے
عرصہ نہیں کچھ اسکے طلوع و غروب میں — کیا آفتاب عمر سریع الزوال ہے

زیست ہے فرقتِ محبوب میں دشوار مجھے — نظر آتے ہیں مری موت کے آثار مجھے
واہ وا اے اثرِ عشقِ رخ و کاکلِ یار — جانتا ہے کوئی کافر کوئی دیندار مجھے

جو کفر و دیں کے تختۂ ہستی پہ ہیں نقوش — ... بس کٹ گئے ہوئے سارے حضور کے
جو جو گئے گناہ ہوئے عفو سب کے سب — حوریں ملی ہیں بدلے میں ہم کو قصور کے
کس طرح نیند آئیگی مٹی کے فرش پر — اے فیضؔ گور میں نہیں گدے سمور کے

یہ ٹھنڈے مرے دست و پا ہو گئے | حواسِ مسیحا ہوا ہو گئے
کیا تم نے کٹاری چھری سے ہلال | حقوقِ نمک سب ادا ہو گئے
نمازیں پڑھیں ہم نے میخانے میں | مگر چند روزے قضا ہو گئے
برے وقت میں کون دیتا ہے تن | جو تھے دوست نا آشنا ہو گئے

سخت دل بے مدد غیر کریں کیونکہ سخن | ناقہ چلتا ہے تو آوازِ جرس دیتا ہے
خاکساری پہ طمعدار مرے جاتے ہیں | جانِ اکسیر یہ ہر اہلِ ہوس دیتا ہے
بے تشدد لبِ شیریں سے نہ حاصل ہو مزہ | نیشکر دانت کی تکلیف سے رس دیتا ہے

مزدور بنئے خلق کا بوجھا اوٹھائیے | ۸۱۰ احساں مگر نہ سر پہ کسی کا اوٹھائیے
بازار گرم ہے لبِ جاں بخشِ یار کا | اعجاز کی دکان مسیحا اوٹھائیے
گھر میں خدا کے بیٹھیے بیکار کب تلک | چلئے گیا ہیں نازِ بتوں کا اوٹھائیے

تذکرے ہو رہے ہیں قیامت کے | دن قریب آ گئے قیامت کے
بت کریں دعویٰ انا اللہ | کھیل ہیں یہ خدا کی قدرت کے

نہ مذکور گدائی ہے نہ ذکر بادشاہی ہے
ہمارے گوشۂ وحدت میں کثرت کی مناہی ہے

کبھی صرف اوامر ہے کبھی محو نواہی ہے
مزاج واعظان شہر کیا واہی تباہی ہے

بجز ذکر مئے و معشوق بزم بادہ نوشوں میں
نہ ذکر توبہ آتا ہے نہ فکر عذر خواہی ہے

جی اٹھے لاکھ بار ہم مر کے
معجزے ہیں یہہ انکی ٹھوکر کے

جاں بلب ہوں پسیجتے ہی نہیں
ان بتوں کے جگر ہیں پتھر کے

غفلت اپنی اجل سے ہم سر ہے
سچ ہے سویا ہوا برابر ہے

حال باطن ہے قال سے ظاہر
راز دل کا مری زباں پر ہے

خواب شیریں ہے مجھکو تلخی موت
گو سمجھا ہوں جسکو وہ گھر ہے

بادل برس گئے مژۂ اشک بار کے
اے برق آہ کونسے دن آئے بہار کے

کب تک زبان خلق پہ جاری رہیگا نام
مٹ جائیں گے نشان تلک بھی مزار کے

پہنچائے اپنی خاک کو دامان یار تک
ایسے کہاں نصیب ہیں اس خاکسار کے

ہیں ہمیں مشتاق پیکان ستم ایجاد کے
ہر کسی سے چپ نہیں سکتے چنے فولاد کے

مرہم تحسین عالم کی کہاں تک منتیں
مندمل ہوتے نہیں زخم اس لب فریاد کے

تعب ہے رنج ہے غم ہے الم ہے
فراقِ یار میں سب کچھ بہم ہے

خدائی کا تماشہ دل میں دیکھا
مرا جامِ سفالیں جامِ جم ہے

چلے جائیں گے اٹھتے بیٹھتے ہم
۸۳۰ بلند و پست گو راہِ عدم ہے

تڑپنا تہہ خنجر اے دل نہ تو
لہو میں قبا ان کی بھر جائیگی

دل اس کا جو پتھر ہے کچھ غم نہیں
مری آہ تاثیر کر جائے گی

یہی فکر ہے چپ بجھائے گا کون
اگر سو کھے یہ چشم تر جائے گی

بلبلوں کے گرم جب نالے ہوئے
برگِ گل آتش کے پرکالے ہوئے

سرد و گرم دہر سے محفوظ ہیں
چار عنصر مجھ کو جو پالے ہوئے

ہم کہاں اب درد و رنج و ہجر و غم
وصل کی شب سب کے منہ کالے ہوئے

چاہ میں جنکی ہے ڈانواں ڈول خلق
ہم بھی انکے چاہنے والے ہوئے

کام یارانِ صفا پرور سے کج رو کو نہیں مصقلہ سے دور تیغ موج دریا رہ گئی
اٹھ گئے میخوار پر ساقی کی جی میں یاد ہے بزم برہم ہو گئی شیشہ میں صہبا رہ گئی
فرع کے جلوہ سے کم ہوتی ہے رونق اصل کی ۸۴۰ دل ہوا روشن تجلی سویدا رہ گئی

سیر کیا خاک بحر و بر میں ہے خشک و تر سب مری نظر میں ہے
باغ جنت ہے چاک جیب اپنا جب سے وہ حور زاد بر میں ہے
خندہ زن ہے ثبات پر بیر ہے بے ثباتی جو کچھ شرر میں ہے
بحرِ دنیا سے ہم گئے اس پار فیضؔ ابھی تو اگر مگر میں ہے

بجائے مور خرمن میں ہمارے بجائے دانہ چنگاری پڑی ہے
لکھا ہے یہ فراز گور جمشید غنیمت ہے خوشی کی جو گھڑی ہے
سمجھ کر زیر گردوں کر گذارا بلائے آسمانی بھی کھڑی ہے
صبا خاک گلستاں کر نہ برباد چمن میں لاش بلبل کی گڑی ہے
کیا دنیا و ما فیہا سے انکار فقیروں کی بھی کیا ہمت بڑی ہے

دل سے آیا جو مرے دیدۂ تر تک پانی ۸۵۰ ہو گیا ہے غم جاناں سے جگر تک پانی

اشک کی سیل کا یہہ جوش ہوا روز فراق لے گیا مجھ کو بہا یار کے گھر تک پانی

پھوٹ جائے جو مرا آبلۂ دل اے فیض موج زن ہوئے ابھی بحر سے بر تک پانی

خواہان محبت ہوں عداوت نہیں آتی آتا ہے مجھے شکر شکایت نہیں آتی

وہاں کام تو ہوتے ہیں خوشامد سے بر آمد کیا فکر کریں ہم کو سماجت نہیں آتی

جب چاہتے ہو آگ لگاتے ہو دلوں میں پھر کہتے ہو کچھ مجھ کو شرارت نہیں آتی

کیا سخت ملے طالع ہے کروں کس سے شکایت کچھ تم کو رہ و رسم مروت نہیں آتی

جیتا ہوں تصور میں دہن اور کمر کے ہستی مری موجود میان دو عدم ہے

ہے تیرہ دروں جلوہ دہ بزم سیہ بخت داغ دل محرور چراغ شب غم ہے

ہم سنگ ترے لب سے ہو کیا لعل بدخشاں یہہ جنس ہے کچھ اور وہ کچھ اور رقم ہے

ظلمت کدۂ دہر میں سر کھینچ نہ اے شمع ۸۶۰ یک روز تری خاک تری زیر قدم ہے

تصویر یار کے جو کشاکش میں پڑ گئے نقشے بنے بنائے ہمارے بگڑ گئے

اے فیضؔ کس بساط پہ پیمیں ہر دل سے عشق　　تھے چار پیسے پاس تو وہ بھی نبٹ گئے

بوٹی بوٹی میں اسکی چھل بل ہے　　ابھی اٹھتی ہوئی وہ کونپل ہے
پاس ہیں پر نظر نہیں آتے　　آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے
وہ بھی ہیں ساتھ ساتھ صحرا میں　　ہم کو جنگل میں روز منگل ہے

سینہ میں پنہاں دل کیا ہوا ہے　　دشمن بغل میں پڑا ہوا ہے
وحدت سے جلوہ کثرت نے پایا　　قطرہ سے دریا پیدا ہوا ہے
فرقت کی تب کے ہیں یہ حرارے　　منہ کا مزا نک بگڑا ہوا ہے
کیا رہنمائی ہوگی خضر سے　　وہ آپ رستا بھولا ہوا ہے
حیرت کی جا ہے صورت سے میری　　وہ آئینہ رو چمکا ہوا ہے

مری عزت کرے وہ یا نہ کرے　　بت سے پھر جاؤں یہ خدا نہ کرے
کیا کریں شکوۂ جفائے فلک　　عمر اپنی ہی جب وفا نہ کرے
جس کو اللہ نے سمجھ دی ہے　　التفات پر وہ اُنکا نہ کرے

جب یہ ٹھہری حضور تم ہو غفور کون ایسا ہے جو خطا نہ کرے

جب یہ ٹھہری کہ ایک ہستی ہے بت پرستی بھی حق پرستی ہے
رحم ہے شرطا اے حرارت عشق جان تن میں پڑی پھلستی ہے
آسماں پر بھی ہے غم و شادی ابر روتا ہے برق ہنستی ہے

دوزخ کدھر بہشت کہاں کیا ہے واہیات اعمال آگے آتے ہیں اپنے کئے ہوئے
ہم بھی خیال یار میں جاتے ہیں گاہ گاہ پھرتے ہیں جیسے خواب میں مردے جئے ہوئے

از خود حرم گئے نہ کبھی ہم گیا گئے ۸۸۰ بندہ تجھے عشق کے وہ جہاں لے گیا گئے
اے وصلِ یار اب تو ترحم ضرور ہے دردِ غمِ فراق مری جان کھا گئے

رہا جو ٹوہ میں برسوں خدا کی بہت چوکا بڑی میں نے خطا کی
وجودِ غیر ہے صرف اعتباری جو ہستی ہے وہ ہے ہستی خدا کی
ملے کہہ کر بلا میں پھنس گئے ہم نہ سوجھی ابتدا میں انتہا کی

مری آنکھوں سے کر نظارہ اے فیضؔ ہر ایک صورت میں ہیں معنی خدا کی

جلوۂ یار نا مکرر ہے ہر تجلی برنگِ دیگر ہے
فہم میں آئی کب وہ ذات محیط عقل کے دائرہ سے باہر ہے
تا کجا ذکر و فکر شغل اشغال دید وا دیدِ یار بہتر ہے
دید سے ان بتوں کے کیا حاصل فیضؔ اپنی نظر خدا پر ہے

سیکڑوں ہت کھنڈے ہیں یاد اسکو ۸۹۰ کب ہمارے وہ ہاتھ آتا ہے!!
اس سپنجی سرا میں سب ہیں رفیق گور میں کون ساتھ جاتا ہے!!

دو عالم میں وہ خود نما ایک ہے نہیں جھوٹ اس میں خدا ایک ہے
موحد ہوں میں وحدہٗ ہے گواہ مرے پاس سب ماسوا ایک ہے
بہت خاک چھانی کھلا جب یہ گل نہ خاک شاہ و گدا ایک ہے

ہر شان میں شانِ کبریا ہے وہ آپ ہے کون ماسوا ہے
موصوف ہر اک صفت سے ہے وہ ہے درد کہیں کہیں دوا ہے

جانتے ہیں تجھے سب آپ کی محفل والے
اچھے اچھے جو مسیحا ہیں بڑے دل والے

غرق گرداب فنا ہو جو مری کشتیٔ عمر
موج ساں سر کو ٹپکتے رہیں ساحل والے

فکر مرہم نہ کرائے فیض پر اس مژگاں سے
زخم سینے کے جو کاری ہیں انہیں سلوالے

اچھی کہانی رات کہی زلف یار کی
ہووے دراز عمر دل بیقرار کی

یہہ بھی کوئی مزاج ہوائے آتشیں مزاج
برباد آبرو ہو کسی خاکسار کی

کیا کہیں اور کدہر جائیں کریں کیا اللہ
تاب گفتار گئی طاقت گفتار چلی

شکر صد شکر کہ اس میکدۂ عالم سے
روح مستان قدح نوش سبکبار چلی

فیض کچھ کم تجھے کلیجے میں ہمارے سوراخ
مژۂ یار جو ایک اور انی مار چلی

باہم ارباب تمنا کو جدا کرتا ہے
فلک تفرقہ انداز یہہ کیا کرتا ہے

وہ گئے دن جو ٹپکتے تھے مژہ سے آنسو
اب تو لخت جگر آنکھوں سے گرا کرتا ہے

مجھکو آزاد نہ کر قید سے چندے صیاد
بے پر و بال کو بھی کوئی رہا کرتا ہے

موجۂ باد بہار چمنستان بہشت
مشہد فیض پہ جاروب دیا کرتا ہے

رُباعیّات

اے نورِ مبینِ حق تعالیٰ — اے صدر نشینِ عرش والا
ہے بدرِ نبوت آپ کی ذات — حلقہ ہے صحابیوں کا ہالا

اے فیض اگر قائلِ وحدت ہے تو — اِس کثرتِ وہمی سے نہ کر شبہ کبھو
معلوم ہوا فَقُل تعالوا سے ہمیں — کچھ فرق نہیں نبیؐ علیؓ میں سرِ مو

جو داغ ہے ماہتاب ہو جاتا ہے — جو ذرہ ہے آفتاب ہو جاتا ہے
اے فیض یہ مرتبہ ہے اُسکا نجف — جو بندۂ بُوتراب ہو جاتا ہے

کرتا ہے جو مولود رسولؐ مقبول — ہوتے ہیں مقاصد سب اسکے حصول
کہتی ہے یہ شمع زبان سے اپنی اے فیض — خوش رہتے ہیں اس سے آل اصحابِ رسولؐ

دنیا سے کہیں خوب مرادیں ہووے — راحت سے دل و جان کی تسکین ہووے
تکلیف سے دو جہاں کی محفوظ رہوں — یا رب یہہ دعائے فیض آمین ہووے

بیدار ہی رہتی نہیں سوتی ہے شمع — منہ آنسوؤں سے رات کو دہوتی ہے شمع
حضرت کا فراق ہے اسی وجہہ سے فیض — ہر محفل مولود میں روتی ہے شمع

افلاس ہوا دور فراغت آئی — تکلیف مٹی رنج کی راحت آئی
اے فیض کرم سے شافی مطلق کے — نزدیک بخوبی مرے صحت آئی

بہار حسن رخ بتلا رہی ہے — ہر اک مومن کا دل گہلا رہی ہے
کہڑی ہو محفل مولود میں شمع — تجلی طور کی دکھلا رہی ہے

رخ پُر نور کو دکھلاتی ہے — مہ و خورشید کو شرماتی ہے
شمع جو محفل میلاد میں ہے — شجر طور نظر آتی ہے

مخمّس

بے ادب کی ہو یا ادب کی بات — یاد رکھتے ہو تم تو سب کی بات
پر جو ہوتی ہے میری ڈھب کی بات — بھول جاتے ہو دن کو شب کی بات
بات یہہ ہے بڑی غضب کی بات

نہ پڑھو تم کبھی حکایتِ عشق — نہ لکھو تم کبھی حکایتِ عشق
نہ کہو تم کبھی حکایتِ عشق — نہ سنو تم کبھی حکایتِ عشق
ہے بہت رنج کی تعب کی بات

نہیں اچھی پریت بے موقع — نہیں موقع کی ریت بے موقع
ہار سے بد ہے جیت بے موقع — ہے کڈھب بات جیت بے موقع
بات اگر ہے تو ہے ادب کی بات

مثلّث

دکھ یہ دکھ ہیں ایک جی کے واسطے　　پس رہا ہوں میں کسی کے واسطے
دم لبوں پر ہے دہڑی کے واسطے

کرنہ اے عمرِ رواں مجھ سے گلا　　ہوں مسافر کام دل با دل سے کیا
چرخ بس ہے راوٹی کے واسطے

ہر کسی کے آگے بیجا ہے گلا!　　کب وہ پیش آتے ہیں نیکی سے دلا
جن کی خلقت ہو بدی کے واسطے

پڑ گیا ہے اب تو ہر حس میں خلل　　موت آئے یا نہ آئے آج کل
ہم تو مرتے ہیں کسی کے واسطے

ہم نے مر مر کر کیا ہے امتحاں　　مر گئے پر رشتہ ناتا ہے کہاں
ہیں یہ سارے جیتے جی کے واسطے

خود بخود رزاق پہونچاتا ہے قوت　　فیض کیوں کرتا ہے اتنی کا کلوت
ایک دم کی زندگی کے واسطے

تاریخ تولد حضرت میر محبوب علیخاں غفران مکان آصفجاہ سادس

ہوا ہے افضل الدولہ کو فرزند | یہی تھا انکے دل میں بھی ارادہ
سر اقبال سے ہے فیض تاریخ | رہے یارب سلامت شاہزادہ
۱۲۸۳

ولہ

ہوا فرزند جب شاہِ دکن کو | سروراں کو ہوا ایک لخت پیدا
سر اعدا لگے پامال ہونے | ہوا جب زیب تاج و تخت پیدا
کہا اے فیض میں نے سال اسکا | ہوا لائق ہمایوں بخت پیدا
۱۲۸۳

تاریخ پل رود موسیٰ

پل لبِ موسیٰ بنا ہے اِس لئے | نفع لیوے اُس سے تا ہر جزو کل
فیض نے لکھی ہے تاریخ بنا | واہ کتنا خوب ہے موسیٰ کا پل
۱۲۷۷

تاریخ وفات نواب شمس الامرا امیر کبیر بہادر

جناب فلک رتبہ امیر کبیر | ہوئے عازم سیر ملک زمیں
کہا فیض نے رو کے سال وفات | دلا کوئی ایسا ریاضی نہیں

انتخابِ قصائدِ نعتیہ

ہے روئے محمدؐ گلِ خندانِ رسالت
ہے گیسو و خط سنبل و ریحانِ رسالت

پروانہ ہر اک شب دلِ اربابِ صفا ہے
ہے نورِ جبیں شمعِ شبستانِ رسالت

اِس حسن سے خوبی سے کسی سے بھی ہوتا
جو تم سے ہوا ہے سر و سامانِ رسالت

اب کوئی مقابل نظر آتا ہی نہیں ہے
تا حشر ہو تم فارسِ میدانِ رسالت

ہوتا ہے گماں عرش معلےٰ کا جہاں کو
کس درجہ یہ ہے رفعتِ ایوانِ رسالت

کیوں کر نہ کرے ختم رسل آپ کو اللہ
ہے کون سوا آپ کے شایانِ رسالت

کیا فیضؔ کا منہ ہے جو کرے وصف سراپا
قد آپ کا ہے سروِ گلستانِ رسالت

کروں جان و دل کو فدائے محمدؐ
جو دیکھوں رخِ باصفائے محمدؐ

دلیلِ مبین من رانی ہے اسیر
لقائے خدا ہے لقائے محمدؐ

شفاعت وہ ہم عاصیوں کی کرینگے
یہ ادنےٰ ترین ہے عطائے محمدؐ

دلیل ولائے خدا ہے مقرر — رہے جسکے دل میں ولائے محمدؐ

زہے قسمت اپنی زہے عزت اپنی — اگر دیکھ لیں ہم سرائے محمدؐ

اطاعت خدا کی اطاعت ہے انکی — رضائے خدا ہے رضائے محمدؐ

کسی کی شفاعت سے مطلب نہیں فیض — کھڑا ہوں میں زیر لوائے محمدؐ

کعبۂ مقصود ہے روئے رسولؐ — قبلۂ عالم ہے ابروئے رسولؐ

کیوں نہ محو دید پیغمبرؐ رہوں — ہے عبادت دیکھنا سوئے رسولؐ

مہبط روح الامیں ہے صبح و شام — جنت الماوا ہے مشکوئے رسولؐ

راس آئے گی مدینہ کی ہوا — ہے مجھے سودائے گیسوئے رسولؐ

قبلۂ ارباب دیں ہے روئے خیر المرسلیں — طاق بیت اللہ ہے ابروئے خیر المرسلینؐ

عارض پر نور کا خاکہ ہے خورشید سحر — صبح صادق ہے غبار کوئے خیر المرسلینؐ

ہے ید بیضائے موسےٰ پنجۂ انور کا عکس — موج بحر نور ہے بازوئے خیر المرسلینؐ

نازل اوسکی شان میں آیا ہو جب خلق عظیم — کیا رقم ہو مجھ سے وصف خوئے خیر المرسلینؐ

پاس جنت کی ہوا کو میں کبھی آنے نہ دوں — ہے مرے سر میں ہوائے کوئے خیر المرسلینؐ

آفتابِ مغفرت کی دید کا مشتاق ہوں
جلد دکھلادے خدایا روئے خیر المرسلینؐ

دل لگی میری سوادِ یثرب و بطحا میں ہے
فیضؔ ہوں دیوانۂ گیسوئے خیر المرسلینؐ

مدت سے مرے سر میں سمایا ہے سودائے مدینہ
اللہ دکھادے کہیں صحرائے مدینہ

چھوڑے بھی رکھوں پانوں نہ گلزارِ ارم میں
تھوڑی سی بھی ہاتھ آئے اگر جائے مدینہ

ہر اہلِ صفا کا یہی وظیفہ ہے شب و روز
کعبہ کا تو لا ہے تو لائے مدینہ

مخدومِ ملایک کے مقرب ہیں خدا کے
جبریلِ امیں خادمِ مولائے مدینہ

اے آرزوئے خلد کہیں اور چلی جا
رہتی ہے مرے دل میں تمنائے مدینہ

غش جس کے صفا پر دلِ اربابِ صفا ہے
تصویر کا عالم ہے سراپائے مدینہ

ہوں معتقد سلسلۂ زلف پیمبر!!
میرا دل دیوانہ ہے شیدائے مدینہ

اے فیضؔ گریبان کے ٹکڑے نہ کروں میں
ہاتھ آئے اگر دامنِ صحرائے مدینہ

رسالہ

فیض جاری عہد میں

نواب فلک جناب بندہ گان عالی

حضرت آصفجاہ نظام الملک نظام الدولہ فتح جنگ

میر فرخندہ علیخان بہادر مد ظلہ العالی کے

شہر فرخندہ بنیاد حیدر آباد میں واسطے تعلیم طلبا کے

سرکار شمس الامرا بہادر امیر کبیر کے

سنگی چھاپے خانیکے درمیان سنہ ۱۲۵۲ ہجری میں

چھپا

ہے جو اللہ جان اوس کو خدا | ہے معک تیرے ساتھ الگ ہی جدا

نیستی ہے نبود ہستی بود | عبد بندہ آلہ ہے معبود

ہے وہ حافظ جسے ہو قرآں یاد | شور ہنگامہ ہے فغاں فریاد

کہہ بنی فاطمہ کو سید بیر | ہے مرمّت کا ترجمہ تعمیر

شمس ہے آفتاب دین اسلام | ایک معنی رکھیں درود و سلام

فیض الہام ہے ضیاء ہے نور | ہے جو تنور جان اوس کو تنور

روشنی نور ہے عماد ستون | گھوڑ گلخن ہے اور بہار ہی تون

رمح نیزہ ہے اور حسام ہے تیغ | ہے لڑائی ستیز حرب ستیغ

دوست محبوب خال جو ہی شہ ہی | ہے جو تجھ دہی تو پشہ ہے

فیض جاری رکھا ہے اسکا نام | تا ہوں سیراب اس سے تشنہ انام

نفس اور عین کی ہے معنی ذات | مزہ لذت ہے جمع ہے لذات

عین چشم آنکھ گوش اذن ہی کان | انف بینی ہے ناک گھر ہی مکان

کام تالو لساں زباں ہی جیب | طرفہ نادر ہے اور غریب عجیب

پہونچیا ساعد ہی دست وید ہی ہات | آوخ افسوس وحیف ہی ہیہات

انگلی انگشت ظفر ناخن ہے | ترجمہ ہے دریغ کا ہے ہے

تو کفِ دست کو ہتیلی جان | عربی روح فارسی ہے جان
ہے جو سینی تو اوسکو شین سمجھ | دُرد تلچھٹ کو تہ نشین سمجھ
دوغ ہے چھاچ اور تس ہے رات | کہہ دہی اور ماست کو جغرات
نقل نکتی وغیرہ جائے ہے سار | چمچہ ڈوئی ہے اولتی پاسار
اوکلی ہاون استری ہے زن | چھلنی غربال کیا ہے پرویزن
کفچہ کڑ ہچا ہے اور کیس ہے بال | ہانڈی دیزی ہے اور جوش ادبال
چمٹہ انبر صواب ہے نیکی | ماہی تابہ کڑاہی تلنے کی
ساتھ میرے ہے معنٰی نی ہے | جو جلیبی ہے وہ زلیبی ہے
جو رکابی بڑی ہے دوری جان | چھوٹے پیالے کو کہتے ہیں فنجان
ایک برس کی جو شئے ہے ایکسالہ | گائے کا بچہ عجل گوسالہ
ابن بیٹا پسر ہے باپ پدر | وہ جو بیردل ہے باہر اور بدر
خشک یابس ہے اور رطب ہے تر | کہہ تو بیٹی کو بنت اور دختر
ام مادر کا ترجمہ ہے ماں | یاد رکھ ہے پناہ امن دا ماں
بس جسے بولتے ہیں وہ ہے بہ | اخت خواہر بہن پھپی عمہ
جو کلیجا جگر ہے پوت ہے وہ | ہے جو مکڑی سو عنکبوت ہے وہ

ہے جو دادا اپنا ہے اور دادی | ہے جو آہنگری سو حدادی
سحر جادو ہے اور خوش ہے طاب | ہے جو لٹو کہیں اوسے طبطاب
کہیے پھوندی کو نان کی بورک | جو شتر نال ہے وہ زنبورک
سیس کہتے ہیں جسکو سر ہے وہ | ہے جو پوتا نواسہ ہے وہ
تیس ہندی میں کہتے ہیں سی کو | صندلی بولتے ہیں کرسی کو
جو ہے جاڑا اوسے کہیں پالا | پست کوتہ بلند ہے بالا
ملک کشور ہے اور ملک ہے آن | ہے جو اکنوں ابھی ہے اور الآن
ہے پرانا نیا قدیم جدید | کہہ تو لوہے کو آہن اور حدید
ہے جو مجمع وہی تو میلا ہے | ہے جو قسیل وہ کمیلا ہے
زر ہے انگور خمر بادہ ہے | جو کماں نرم ہے کباوہ ہے
ہے جو چنگاری ہے شرارا خگر | اژدرا اور اژدہا کو بول اجگر
چغد الو جو ہے سو بوم ہے وہ | ہر زمیں جو ہے مرز بوم ہے وہ
غنچہ ہر ایک کلی کو کہتے ہیں | گربسہ چھپکلی کو کہتے ہیں
ہے عمق گہرا اور کنواں ہے بیر | خواب رویا بیان ہے تعبیر
ہے رضائی لحاف شبہ ہے شک | کہہ نہالی کو بستر اور توشک

بڑی چھلی کو اب تو وال سمجھ　　قلعہ بیگی کو کوتوال سمجھ

کہہ گلہری کو موشکِ پرّاں　　کاٹنے والے کو کہیں برّاں

بیشہ جنگل ہے حرفہ ہے پیشہ　　کسب پیشہ بسولہا ہے تیشہ

ترش پالا ہے ٹوکرے کا نام　　ہے صنم ایک جمع ہے اصنام

ڈیرا خرگاہ خیمہ جمع خیام　　غم الم خیمہ دوز ہے خیام

جو سہاگن ہے اوسکو عرس کہیں　　اور نیول کو ابن عرس کہیں

چھاگل ابریق ہے حزیں آسی　　ہے جو ہشتاد کہہ اوسے اسی

ہے جو مرغی دجاجہ اوسکو جان　　حیلہ گر مسخرے کو کہہ مجّان

لوح تختی ہے اور حول ہے گرد　　ہے جو تلمیذ کہہ اوسے شاگرد

قالب اور کالبد جو ہے تن ہے　　غسل دہونا ہے اور شستن ہے

ہے مزامیر بربط و قانون　　رسم اور قاعدہ بھی ہے قانون

قرعہ پانسہ ہے اور تفاول فال　　پختہ ظرف گلی کو بول سفال

خورد چھوٹا ہے اور بزرگ بڑا　　غیر بیگانہ اوفتادہ پڑا

تیرنا پیرنا شنا ہے وہ　　جو یگانہ ہے آشنا ہے وہ

کلمہ ہے سخن حدیث ہے بات　　کہیں مصری کو فارسی میں نبات

نصف آدھا ہے فارسی ہے نیم — دشمن و حاسد و عدو ہے غنیم

برگ پتّا ورق ہے میوہ بر — ہے نشیب و فراز زیر و زبر

ورد گل پھول اور الف ہزار — کہہ تو بلبل کو عندلیب و ہزار

جرح اور زخم گھاؤ ہے اور دار — سقف چھت ہے جدار ہے دیوار

جو فساں ہے سمجھ تو او سکو سان — دیو شیطان انس ہے انساں

خشک سوکھا ہوا ہے گیلا تر — ہے رماد اور راک خاکستر

نمل چیونٹی کو بولتے ہیں مور — ہے جو طاوس کہہ اوسے بھی مور

شحم و چربی کو پیہ کہتے ہیں — دشت و صحرا کو تیہ کہتے ہیں

بحر دریا ہے آب کو جل کہہ — مراۃ آئینے کو سجنجل کہہ

گھاؤ گہرا جو زخم ہے کاری — اور خدیعت جو ہے وہ مکاری

صحت آرام سکھ شفا ہے وہ — اور کنارہ جو ہے شفا ہے وہ

ہے فرشتہ ملک سروشہ ہے — راحلہ زاد راہ توشہ ہے

عزم ارادہ ہے قصد ہے نیت — میں پنے کو کہیں انانیت

نام جسکا خدا ہے حق ہے وہ — ہے جو لائق سو مستحق ہے وہ

لا کہہ ہندی ہے فارسی ہے لک — آسماں اور سما ہے چرخ فلک

ہے جو غالب اوسے کہیں وَرہے | ہے جو صاحب ہنر ہنرور ہے

ہے جو معمار اوڑ ہے اور راج | اور تیبنر جو ہے وہ ہے درّاج

گفتگو بات جیت قیل و قال | تول اور وزن کو کہیں مثقال

دھوپ ہے آفتاب سرد ہے برد | کہہ تو چادر کو بھی ردا اور برد

حاجت اور احتیاج فاقہ ہے | معنئ ہوش بھی افاقہ ہے

پھندنا حلقہ ہے اور جال دام | مغزلب ہے تو لوز ہے بادام

موج ہے لہر اور فلک ہے ناؤ | غوص غوطہ مواقفت ہے نباؤ

بخت و عظمت تونگری جد ہے | جو زمرد ہے وہ زبرجد ہے

تشنگی عطش پیاس باراں طل | عطش ہے چھینک پہلواں ہی بطل

ہے جو بوڑھا ضعیف ہے اور پیر | شنبہ ہفتہ ہے اور دوشنبہ پیر

ہے جو تیتی تتیلہ ہم غنسم ہے | ہے جو شلجم وہی تو شلغم ہے

جشن عیش و طرب ہے رسم ہی ریت | جس کو گندک کہیں وہی کبریت

ہے جو لو لو سیجھ اوسے دُر ہے | جو بھلاداں ہے وہ بلادر ہے

تحفہ سوغات میہمان ہے ضیف | جو ہے جاڑا شتا ہی گرمی صیف

قرد باندر ہے بوزنیہ میموں | اور مبارک خجستہ ہے ہمیوں

گاؤں قریہ ہے دیہ بلد ہے شہر　　روز یومیہ ہے جھینہ شہر

ہے جو اسفنج ابر مردہ ہے　　ہے جو معدود وہ شمردہ ہے

تنہی خط جو ہے محیط ہے وہ　　ہے جو دریا بڑا محیط ہے وہ

گوشہ چشم کو سمجھ توماق　　چلمک آتش زناں کو کہہ چقماق

ہے کنارہ قنارہ کہان ہے کمان　　نوک انی بید برگ ہے پیکان

فیض جاری ہوا مرتب جب　　تب کہا سب نے ہی نصاب عجیب

اوسکی تاریخ مجھ کو یوں بھائی　　فیض کا یہہ رسالہ ہے بھائی
۱۲۸۶

رسالہ فیض جاری تصنیف کیا ہوا مولوی حافظ میر شمس الدین محمد المتخلص
فیض کا پڑھنے والوں کی تربیت کے واسطے موافق عدد نام مولوی
شمس الدین محمد کے چھ سو انیاسی بیت پر سوائے دو بیت
تاریخ کی سنہ ۱۲۸۶ بارا سو چھیاسی ہجری میں مرتب ہوا

تمت
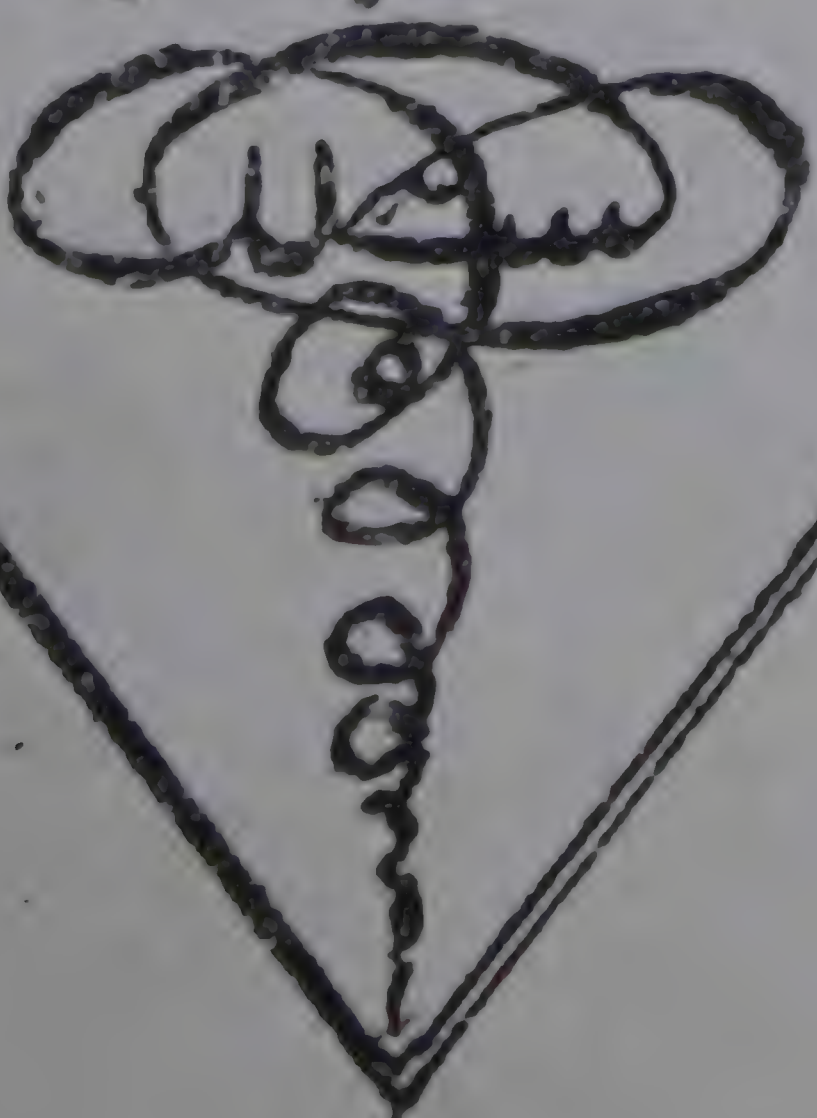
انتخاب از تقریظ دیوان فیضؔ

مولفہ رائے بچو لال تمکینؔ

فیض فیاضِ مطلق کا ہر حال میں جاری ہے اُس کی حمد و شکر کی مصروف خدائی ساری ہے دیوان فیضؔ میں اُس کا انعام عام ہے فیض بخشی اور فیض رسانی اُسی کا کام ہے...... بحور فیض اسکی ہمیشہ جوش پر ہیں اور ارکان کائنات تسبیح میں اسکے خروش پردہ فیاض ہے کہ فیض عام اس کا ہر سبب سے مبرا ہے اور یہہ فیض ہے اوس کا کہ خیمہ نہ تہی افلاک بے وند و فاصلہ برپا ہے بلدہ فاخرہ فرخندہ بنیاد حیدر آباد میں حرسہا اللہ تعالےٰ من الآفات والبلیات اس قدر علماء اور فقہا و فضلا و شعرا کا اجتماع ہوا کہ فلک پیر نے باوجود اس کہن سالی کے ایسا مجمع اور ایسی صحبت حاشا نہ دیکھا ہوگا ہر ایک اگر گل ہے مانند بلبل اس کے شکر فیض کا غزل خواں ہے اور اگر خار ہے اس کے نم فیاضی سے تازہ و ریاں ہے۔ مثنوی

عالم ہے ظہور فیض فیاض	ہے پرتو نور فیض فیاض
کیا فیض اسکا جوش پر دیکھ	ہے فیض ہی فیض غور کر دیکھ
کیا ایک قطرہ ہی فیض اُس کا	دریا دریا ہے فیض اُس کا
دریا جسے کہتے ہیں وہ کیا ہے	اِک قطرہ اسی کے فیض کا ہے

ہوتا نہ اگر یہ فیض جاری	کُن پر ہوتا قلم نہ جاری!
کیا فیض ہے واہ واہ کیا فیض	ہے ارض بھی فیض اور سما فیض
فیض اسکا ہے شمس یا قمر ہی	ہر ذرہ سے فیض جلوہ گر ہے
کیا لکھئے ہے فیض کا جو عالم	اک دفتر فیض ہے دو عالم
شکر اس فیاض کا ہو کس سے	کونین ہے فیضیاب جس سے

اس جماعت بزرگوار ان سے عقل کل اور معلم اول ہے خصوصاً ذات بابرکات ستودہ صفات جناب حضرت مولوی حافظ میر شمس الدین محمد فیض تخلص کرتے تھے کہ باوجود کثرت امور دنیوی کے اجماع کمالات صوری و معنوی میں وحدت انہیں کے ذات فیض سمات پر ختم ہوئی بلا تکلف و تصنع مبداء فیض سے ایسے جوہر کمالات ان کی عرض ذات میں بھرے ہوئے تھے کہ غوامض و دقایق ہر علم کے فیض زبان فیض ترجمان پر دھرے تھے فضل و بلاغت و فصاحت و طلاقت میں یکتائے عصر اور بہمہ دانی و بدیہہ خوانی و فیض بخشی و فیض رسانی میں یگانۂ عہد کس قدر شفقت میں عمر گراں مایہ صرف کی ہوگی کہ اس نحو کے کمالات حاصل ہوئے ہوں گے منطق سے انکے معانی ٹپکتے تھے اور ہیئت سے ان کے شعاع خطوط فلکی جھلکتے تھے ہندسہ بازان دہر کو تادیب ان کی بس تھی فروع کا کیا حساب اصول پر نظر مقدس تھی عروضی ایسا پیدا ہوا اور نہ ہوگا کہ قافیہ تنگ کیا جس محفل شریف میں وارد ہوئے اہالیان محفل کو ایک بات میں دنگ کیا شہر استاد' ان کو اگر کہئے تو خطا ہے بلکہ عالم استاد کہنا بجا ہے ہنوز تربیت سے ساکنان خطہ پاک کے فراغ حاصل نہوا تھا

کر واسطے تعلیم و تلقین متوطنان عالم پاک کی ارادہ کیا۔ افسوس افسوس ہزار افسوس
کہ ایسا فرد کامل دفتر سے زمانے کے گم ہوا سخن سرائی کا چرچا مٹ گیا شہر سے کیا بلکہ زمانہ سے
فیض اٹھ گیا خوب کہا محمد غوث عزم نے سلمہ اللہ تعالےٰ

اٹھ گیا اس جہاں سے فیض سخن　　　چل بسے یعنے وہ سخن رس فیض

عزم مغموم نے لکھی تاریخ !!　　　حیدر آباد سے گیا بس فیض

بچولال تمکین تخلص مولف اس چند سطور یادگار دہور نے کہ گاہ بگاہ فیض یاب صحبت سراپا
برکت رہتا تھا دو قطعہ تاریخ اس واقعہ جانگاہ جگر سوز کے زبان پر لایا۔

رفت چوں فیض سخندان زماں شمس الدین　　　کرد تمکیں بدو مصراع دو تاریخ بیاں
شنبہ پنجم کہ شب چاردہم ماہ رجب　　　فیض آسودہ زکونین با یوان جناں
شہر استاد میر شمس الدین　　　تخلص بہ فیض فیض رساں
باہمہ علم و فضل و فن و کمال　　　عارفے بود و حافظ قرآں
کرد رحلت ز دہر تمکیں گفت　　　فیض از ینجا نمود عزم جناں

اگرچہ اس جناب تقدس ماب سراسر فیض کو اشغال ظاہری اور باطنی سے فرصت کب
ہوتی تھی کہ طرف ماسوی اللہ کے متوجہ ہوں ولیکن نظر او پر طیب خاطر فیض ماثر کے
کبھی زبان عرب اور کبھی زبان عجم اور کبھی زبان اردو میں واسطے یادگار زمانہ اور
ہدایت تلامذہ کے بطریق ارشاد کچھ فرماتے تھے جب اس جہان فانی سے روانہ عالم
جاودانی ہوئے اور وہ فیض نصیب مجلسیان جنت ہوا یہاں کے لوگوں کو تلاش پڑی کہ

نتایج طبع صافی اور گنجینۂ فیض وافی فراہم کیا چاہئیے تا تحفہ محفل سخنوراں اور ہدیہ جماعتہ معنے پروراں ہو بارے فیض فیاضِ ازل شامل حال ہوا اور صاحب طبع نقاد و ذہن وقاد محمد فیاض الدین خاں متخلص فیاض خلف الصدق محمد عزیز الدینخاں بہادر سلمہم اللہ تعالےٰ نے جو سرامد تلامذہ اس جناب فیض ماب کے ہیں چند مسودہ کلام اردو جمع کر کے تدوین کی اور گہرہائے شاہوار کو رشتۂ ترتیب میں کھینچا ایک گلدستہ نادر مرتب ہوا اور ایک مجموعہ عجیب صورت پکڑا نسیم فیض عطر بیز ہوئی یادگار کے واسطے دست آویز ہوئی اگرچہ تصانیف اس جناب فیض ماب کی صرف و نحو و منطق و معنی و ہیئت و ہندسہ عروض و قافیہ ہر علم و ہر فن میں ہدیہ معنی رسان عرب و عجم بیشتر ہیں ولیکن واسطے سخنداناں ہند و دکن کے یہہ تحفہ عجیب و غریب بہم پہنچایا کہ ناظرین کے غنچہ خاطر کو ہمرنگ باد بہاری کے فیض شگفتگی تازہ بخشتا ہے اور مشام طبایع معنے رسانِ سخن پرور کو نکہت گلہائے لطافت و فصاحت سے تفریح بے اندازہ کرامت کرتا ہے الہٰی یہہ چمنستان خیال آفات خزان دہر سے مصؤں رہے اور یہہ بہارستان فکر صدمات صرصر حوادث روزگار سے ماموں تاریخ اسکی ترتیب کے یہہ ہے

ہوا جب اس چمن میں مجمع فیض	ہوا جاری جہاں میں منبع فیض
یہہ مجموعہ عجب ترکیب پایا !!	نہ کہہ مجموعہ ہے یہہ مرجع فیض
نہ دیواں مرغزار فیض ہے یہہ	غزالان غزل کا مرتع فیض
بھلا دوں قامت موزونِ خوباں	سنادوں گر تمہیں یک مصرع فیض
مہ و خورشید کا مطلع ہے خاور	سراسر ہے یہہ دیواں مطلع فیض

یہہ دیوان فیض کا ہے شعلہ طور
آلہی ہوئے روشن مضجع فیض

ہوئی ترکیب کی تاریخ تمکیں
یہہ ہے دیوان افصح ہبیع فیض

معاذ اللہ او تمکین بے تسکین کہاں تھا تو اور کہاں آگیا کس دریا میں غوطہ مارا اور کس کنارے پر آنکلا حمد و شکر فیاض مطلق کا کر رہا تھا دم نعت محمدی کا بھر رہا تھا یا مدح و محامد مخلوق پیش نہاد خاطر ٹھہری او دیوانے کیوں نہیں کہتا حمداً لہ ثم حمداً لہ اور اُس کے حبیب خاص پر کہ فیض بخش اور فیض رساں سوائے اس کے دوسرا میں دوسرا کوئی نہیں کیوں نہیں درود پڑھتا اللّٰھم صل علی محمد و علی الہ الاطہار و اصحابہ الاخیار وسلم علیہ و علیہم تسلیماً کثیراً کثیراً ٥

اب یہاں سے ہے فیض عام جاری
کرتا ہے قلم گہر نثاری

بہتے ہیں نسیم فیض یہاں سے
تحسیں کی صدا ہے یک جہاں سے

چشمہ بہتا ہے فیض کا اب
دریا ہوتا ہے یک لبالب

جاری ہوتا ہے یک نیا فیض
عالم کہتا ہے مرحبا فیض

گلبن ہے فیض کا گل افشاں
ہوتا ہے ہر ورق گلستاں

کرتا ہے قلم وظیفۂ فیض
ہوتا ہے رقم صحیفۂ فیض

دیوان جناب فیض ہے یہہ
واللہ کتاب فیض ہے یہہ

ادارۂ ادبیات اردو

کے ایک شعبۂ سلسلہ انتخابات شعرائے دکن کی مطبوعات پر تنقیدیں

بادہ سخن ۔ انتخاب کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل مرحوم حیدرآبادی

مرتبہ ۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور مدیر عمومی صفحات ۱۲۹ قیمت ۱۲/

رسالہ ساقی ۔ دہلی ۔ مرتبہ ۔ مولوی شاہد احمد صاحب بی ۔ اے ۔ نبیرۂ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی بابت فروری ۱۹۲۷ء

ڈاکٹر احمد حسین مائل مرحوم کے کلام موزوں کا انتخاب ہے اور نہایت خوبصورت انتخاب ہے مائل مرحوم دکن میں پیدا ہوئے دکن میں پرورش پائی لیکن زبان وہ پیدا کی کہ دہلی والوں کی محفلوں میں سر رہے گئے ۔ کلام میں جسقدر ہمارے پیش نظر ہے آمد ہی آمد ہے ...... یہہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فصیح الملک مرحوم کے صحبت یافتہ ہیں ۔ انکے کلام میں جو بے تکلفی ہے وہ خداداد ہے ۔ اور مقدمے میں دکن کی اردو شاعری پر جو مقدمہ لکھا ہے وہ تو نہایت بصیرت افروز ہے اسلئے اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بادہ سخن میں بہت سی چیزیں مل سکتی ہیں ۔

رسالہ المعلم حیدرآباد ۔ مرتبہ مولوی سجاد مرزا صاحب ایم ۔ اے (کنٹب) بابت دی ۱۳۴۵ف

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ملک کے ان نوجوانوں میں سے ہیں جنکو کام کے بغیر چین نہیں آتا ۔ یہہ نہیں بلکہ وہ نگرانی میں ایک جماعت بھی تیار کر رہے ہیں جو ...... جدید ترین اصول پر ادبی کام کرنا سیکھ رہی ہے اسوقت ہمارے سامنے تین شعرائے دکن کے انتخابات ہیں ...... جناب زور صاحب نے ایک زوردار مقدمہ تحریر فرمایا ہے جو انتخاب کے شروع میں دیا گیا ہے ۔ اسکے بعد ہر شاعر کے کلام کا انتخاب مع اسکے مختصر حالات زندگی

درج کردیے گئے ہیں...... ہمکو توقع ہے کہ ان دیدہ زیب اور دلکش انتخابات کو جنکی قیمت صرف ۱۲ ار فی جلد ہے خرید کر ہر محب وطن

اپنے ذوق سلیم کا ثبوت دیگا اور ہر مدرسہ اپنے کتب خانہ میں اس سلسلہ کے لئے جگہ نکالے گا۔

رسالہ جامعہ۔ دہلی۔ مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی بابت جون ۱۹۳۵ء

حضرت مائلؔ (صاحب بادۂ سخن) ایک قادر الکلام اور پُرگو استاد ہیں، مشکل پسند واقع ہوئے ہیں،

اور عموماً سنگلاخ اراضی شعر کو توڑا ہے اور بعض قدیم مسلم الثبوت اساتذۂ اردو کے تتبع کی کامیاب و قابل داد کوششیں کی ہیں

سراج سخن۔ انتخاب کلام شاہ سید سراج الدین سراجؔ اورنگ آبادی

مرتبہ پروفیسر عبد القادر صاحب سروری ایم۔ اے ال ال بی۔ ۲۱۵ صفحات قیمت ۱۲ ار

مجلہ عثمانیہ حیدرآباد۔ مرتبہ سید اشفاق حسین صاحب بی۔ اے۔ جلد ۱۰ شمارہ ۱

مولوی عبد القادر سروری صاحب نے حضرت سراجؔ اورنگ آبادی کے کلام کا نہایت دلچسپ اور معیاری انتخاب کیا ہے

اور ساتھ ہی دکن کے اس عظیم الشان شاعر کے حالات زندگی اور طرز سخنوری پر نہایت محققانہ اور پُر از معلومات مقدمہ

بھی تحریر کیا ہے۔ مولوی سروری صاحب کو شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق ہے۔ اور ہم چشموں میں وہ اپنی سخن فہمی کی وجہ

سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ انکی کتاب جدید اردو شاعری تمام دنیائے اردو سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہے اور توقع

ہے کہ انکا انتخاب کلام سراجؔ بھی خاص دلچسپی سے پڑھا جائیگا...... کتاب میں حضرت سراجؔ کی تحریر کا عکس بھی

شائع کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ انتخابات کی خوش قسمتی ہے کہ اسکو سراجؔ کے ہم دیوان دستیاب ہوگئے جنمیں سے ایک پر خود شاعر

کے قلم سے چار جگہ حاشیہ پر غزلیں لکھی ہوئی مل گئیں۔

جریدۂ مشیر دکن۔ حیدرآباد بابتہ ۲۶ جون ۱۹۳۷ء

شاہ سراجؔ اورنگ آبادی اردو کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ اگرچہ انکا زمانہ دو سو سال کا ہے لیکن کلام بہت پرانا ہے

قدیم طرز کے شعرا میں ولی کے بعد انکے مقابلہ کا کوئی شاعر نہیں۔ یہ انکے کلام کا ایک پاکیزہ انتخاب ہے غزلیات کے علاوہ

دیگر اصناف کلام کا ضروری اور دلچسپ انتخاب بھی درج ہے۔

مرتب نے سراج کی شاعری اور حیات پر ایک پُراز معلومات مقدمہ لکھا ہے...... اسی طرح دکن کے تمام مشہور شعرا کا کلام مرتب ہو کر شائع ہو جائے تو بہت بڑا کام ہوگا کیونکہ ضخیم دواوین کے مطالعہ کا اب زمانہ نہیں رہا ہے۔ نہ پہلی سی آسودگی ہے نہ فرصت انتخابات کے مطالعہ سے ہر شخص آسانی کے ساتھ شعرا کے محاسن کلام پر عبور حاصل کر سکتا ہے اور قیمت کے لحاظ سے بھی ضخیم دکمیاب دواوین کے مقابلہ میں یہہ معمولی آدمی کے دسترس سے باہر نہیں ہماری رائے میں اس سلسلہ کی وسیع اشاعت عمل میں آنی چاہئے۔

متاعِ سخن۔ انتخاب کلام نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ حیدرآبادی

مرتبہ۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن) مدیر عمومی سلسلہ
صفحات ۱۲۶ قیمت ۱۲

رسالہ ساقی۔ دہلی۔ مرتبہ مولوی شاہد احمد صاحب بی۔ اے۔ آنرز نبیرہ شمس العلماء نذیر احمد دہلوی بابت فروری ۱۹۳۷ء

یہہ جناب عزیزؔ کا انتخابی کلام ہے مگر نہایت پاکیزہ جذبات سے لبریز اور شاعری کا پورا نمونہ... ان (عزیزؔ حیدرآبادی) کا شاعرانہ ذوق دیکھکر یہہ سمجھ میں آیا کہ حضرت ذوقؔ مرحوم کے دل میں دکن نے کیوں چٹکی لی تھی اور میر انیس مرحوم کس لئے حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ اگر میرے سامنے جناب عزیزؔ کی صرف شاعری ہوتی اور ان کے احوال سے بے خبر ہوتا تو میں بلا مبالغہ یہہ سمجھتا کہ مومن خاں مرحوم کا کوئی شاگرد انکی بعض خصوصیات سے علحدہ ہو کر مرزا داغ کی زبان بول رہا ہے زبان میں انکی لغزش نہیں۔ بیان میں انکے زور، بندش انکی چست غرض کہ شاعری کے لئے جس کیفیت کی ضرورت ہے وہ .... ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ کا احسان ماننا چاہئے کہ انھوں نے ...... دکن کے ... قابل قدر شعرا کے کلام سے ہمیں روشناس کرایا۔